انتخابِ جوش

انتخابِ جوش

جوش ملیح آبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ

مرتبہ

احتشام حسین
صدر، شعبہ اردو
مسیح الزماں
لکچرر، شعبہ اردو
الہ آباد یونی ورسٹی، الہ آباد

پبلشر

کتاب محل (پرائیویٹ) لمیٹڈ

زیرو روڈ۔ الہ آباد

فہرست

فکریات ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۹

واردات ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۴

رنگ و بو

رباعیات

مقدمہ

جوشؔ ملیح آبادی کی شاعری اور شخصیت دونوں کے متعلق اتنی مختلف اور متضاد رائیں پیش کی گئی ہیں کہ ایک معمولی مطالعہ کرنے والا آسانی سے ان کی شاعری اور زندگی کے بارے میں رائے قائم نہیں کرسکتا۔ اسے ہر نقاد تسلیم کرتا ہے کہ گذشتہ تیس سال کے عرصے میں انھیں جو شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی ہے اس میں شعروادب کی دائمی اور اعلیٰ قدروں سے زیادہ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات کا ہاتھ ہے کیونکہ ان کی شاعری میں اس توانائی اور دلکشی کا احساس رفتہ رفتہ کم ہوتا جارہا ہے جو آزادی سے قبل نظر آتا تھا، لیکن صرف اتنا کہہ دینے سے بات پوری نہیں ہوتی اور اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ان کی شاعرانہ اہمیت اور عظمت کا مقام متعین کرنے کے لیے ان کی زندگی، شخصیت، ماحول، خیالات اور شاعرانہ کارناموں کا جائزہ لیا جائے اور ان کی روشنی میں ان کی شاعری کے اعلیٰ اور روایتی حصوں کو الگ کرلیا جائے۔ ہر شاعر کی طرح ان کے یہاں بھی بلند و پست ہیں، ان کے افکار

میں بھی عارضی اور دیرپا، ہنگامی اور عمیق خیالات کی کارفرمائی ہے اور وہ بھی تصورات کے جذبات کے اظہار میں یا تو اپنے نقطۂ نظر کا خیال نہیں رکھ پاتے ہیں یا اسے اتنا واضح کرتے ہیں کہ شعریت مغلوب ہو جاتی ہے۔ بہر حال جدید اردو ادب میں انھیں بھی وہ عہد ساز حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آباد (ضلع لکھنؤ) میں بقول خود دسمبر ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھر آفریدی پٹھانوں کا گھر تھا جو تین چار پشتوں سے اودھ میں اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ جوش کے والد بشیر احمد خاں، دادا محمد احمد خاں اور پردادا فقیر محمد خاں گویا سب شاعر تھے۔ گویا ناسخ کے ممتاز شاگردوں میں تھے جن کا مجموعۂ کلام دیوان گویا اور نثری کارنامہ ترجمۂ انوار سہیلی بستان حکمت کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ اس طرح جوش کا ذہن امارت، افغانی جوش و خروش، شاعری اور قصباتی زندگی کے پیچیدہ مرکب سے تیار ہوا تھا جنھوں نے بعض خاص اخلاقی اور جذباتی قدروں کی شکل اختیار کر لی تھی اور جس سے جوش کبھی باہر نہیں نکل سکے۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر فارسی عربی کی ہوئی، پھر لکھنؤ، سیتاپور اور آگرہ کے مختلف اسکولوں میں سینیر کیمبرج تک کی تعلیم حاصل کی۔ یہ تعلیم اسناد حاصل کرنے کے لحاظ سے بے ترتیب اور ناکامیاب تھی لیکن مطالعہ اور علم کے لحاظ سے اوسط سے زیادہ تھی۔ بچپن ہی میں شاعری کا شوق ہو گیا تھا۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کی حوصلہ افزائی اور مرزا محمد ہارون عزیز لکھنوی کے مشوروں نے اس پر جلا کی۔ کچھ دن مرزا محمد ہادی رسوا کی اتالیقی میں بھی گزرے۔ اچھی بری صحبتوں میں زندگی کے تجربے بھی حاصل ہوئے لیکن

۱۹۱۶ء میں والد کے انتقال اور اعزا کے غیر ہمدردانہ رویہ نے گھر چھوڑنے اور رئیسانہ زندگی کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا۔ ۱۹۲۱ء میں کلکتہ گئے اور وہاں ٹیگور سے مل کر بہت متاثر ہوئے۔ اس کے اثرات ان کے ابتدائی کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ شاعرانہ نثر لکھنے کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوا جس کے نمونے اوراقِ سحر، خیالاتِ زرّیں اور روحِ ادب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۹۲۴ء میں ان کی زندگی میں ایک یا موڑ آیا جب انھوں نے ریاست حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ناظرِ ادب کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ وہاں مرزا رسوا، مولانا عبدالماجد، مولانا عمادی، فانیؔ، مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ وغیرہ کی صحبتوں میں ان شاعری چمک اٹھی۔ ۱۹۳۶ء میں انھیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ دہلی آکر انھوں نے ایک رسالہ کلیم نکالا اور اپنے کئی مجموعے شایع کیے۔ چند سال بعد وہ رسالہ بند ہو گیا اور جوشؔ نے پونا کی ایک فلم کمپنی میں ملازمت کر لی۔ اسی سلسلہ میں چند سال ممبئی میں بھی گزرے۔ اس درمیان میں جوشؔ زیادہ تر ترقی پسند ادبی تحریکات سے وابستہ رہے اور اپنے شاعرانہ انداز میں اشتراکیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد رسالہ آج کل دہلی کے ایڈیٹر ہو گئے اور دہلی میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ ۱۹۵۵ء میں انھیں حکومت ہند سے پدم بھوشن کا اعزاز ملا۔ لیکن اس کے کچھ ہی دنوں بعد وہ مستقلاً پاکستان چلے گئے جہاں وہ ترقی اردو بورڈ کراچی میں اردو لغت کی ترتیب میں منہمک ہیں۔ یہ فیصلہ تو مستقبل کا مورخ کرے گا کہ اس انتقالِ مکانی سے انھیں محض مادّی آسودگی حاصل ہوئی یا شاعر کی حیثیت سے ان کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے چلے جانے نے ہندوستان میں اور وہاں اجنبی ہونے نے پاکستان

میں ان کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔

اس وقت تک ان کے جو مجموعے شایع ہوئے ہیں ان میں اہم یہ ہیں:

روح ادب	۱۹۲۱ء	آیات ونغمات	۱۹۴۰ء
نقش ونگار	۱۹۳۶ء	عرش وفرش	۱۹۴۴ء
شعلہ وشبنم	۱۹۳۶ء	رامش ورنگ	۱۹۴۵ء
فکر ونشاط	۱۹۳۷ء	سنبل وسلاسل	۱۹۴۷ء
جنون وحکمت	۱۹۳۷ء	سرود وخروش	۱۹۵۳ء
حرف وحکایت	۱۹۳۸ء	سموم وصبا	۱۹۵۴ء

پاکستان جانے کے بعد سے وہاں ان کا صرف ایک مسدس طلوعِ فکر (منقبت) شایع ہوا ہے۔ حرفِ آخر جو ان کی طویل فلسفیانہ اور مفکرانہ نظم ہے، نامکمل ہے۔ اس کے کچھ اجزا رامش ورنگ میں شامل ہیں۔ نثری مضامین کا مجموعہ اشارات بھی ۱۹۴۴ء میں شایع ہوا تھا۔ ان کے علاوہ کئی انتخابات شایع ہو چکے ہیں اور کئی مجموعے شایع ہونے کی امید ہے۔

شاعری شاعر کی شخصیت، ماحول، عقائد، شعورِ فن اور درکِ حیات سے وجود میں آتی ہے۔ وہ روایت کی پابندی کرے یا تجربہ کا شائق ہو، بنی بنائی راہوں پر چلتا ہو یا بغاوت کا اعلان کرے دونوں صورتوں میں وہ بڑی حد تک تاریخی جبر کا پابند ہوگا۔ اس کے باہر وہ اس وقت نکل سکے گا جب اس کا شعور اس کا رہنما ہو۔ جوش ملیح آبادی کا ذہنی ارتقا بھی انھیں حقائق کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے جن سے انھیں واسطہ پڑا اور جنھوں نے ان کے دماغ اور انفرادی احساس کی تشکیل اور تعمیر کی۔ فرد یا اس کا ذہن بنا بنایا

نہیں ہوتا، حالات کی چکی میں پِس کر بنتا اور بدلتا رہتا ہے۔ شخصیت کے کچھ گوشے اِدھر اُدھر نکلے ہوئے بھی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایک شخص کبھی کچھ نظر آتا ہے کبھی کچھ، کبھی وہ آسمان پر ہوتا ہے اور کبھی دو گز کے فاصلے پر اسے زمین بھی نظر نہیں آتی۔ خود جوش نے کہا ہے:

> گر جاتا ہوں ذرّات کی ٹھوکر کھا کر
> اور گاہ پہاڑوں سے گزر جاتا ہوں

جوش کا معاملہ عجیب ہے۔ جنون و حکمت کی آمیزش، شعلہ و شبنم سے ساز، فکر و نشاط سے وابستگی، عرش و فرش کی سیر، سیف و سبو سے شغل، سموم و صبا سے دلچسپی اور حرفِ آخر کہنے کی آرزو نے جوش کی شخصیت کو اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔ یہ ایک بے قید و بند ہواؤں کی طرح پھرنے والے شاعر اور وقت کی آواز پر کان دھر کر فکر کے سانچے میں ڈھلنے کی آرزومند تفکّر پسند انسان کی شخصیت ہے جو اخلاقی اقدار اور بے راہ روی دونوں کو دعوت دیتا ہے کہ اسے سہارا دیں۔ جوش کی زندگی اور اطوار میں کلاسیکیت اور رومانیت، متعین راستوں اور نئی جستجوؤں، قدامت اور جدّت کی ایسی آمیزش ہے کہ وہ بعض اوقات مجموعۂ اضداد نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی شخصیت کی اصل روح گرفت میں آنے سے انکار کر دیتی ہے اور اسی تضاد کی پرچھائیاں ان کی شاعری اور افکار پر پڑنے لگتی ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ وہی شخصیت بزمِ سخن میں کچھ اور ہوتی ہے اور بساطِ عمل پر کچھ اور، وہ ایک پروگرام بناتی ہے اور فکر و فلسفہ میں کھو جانے، رندی و سرمستی میں وقت گزارنے، حیات کے قصّۂ خونیں سننے اور تماشائے لبِ بام دیکھنے کے اوقات مقرر کر دینا چاہتی ہے۔ ایسی شخصیت کے سمجھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے چلنے، اس کی صبح و شام میں شریک ہونے، خلوت و جلوت میں اس کے

ساتھ وقت گزارنے، اس کے ساتھ خوشی اور غم کے لمحات بسر کرنے، اسے سوتے جاگتے مشاہدہ کرنے، اس کو دوستوں میں خوش طبعی کرتے اور سنجیدہ صحبتوں میں بحثیں چھیڑتے دیکھنے اور نیاز مندی اور تمنائے ناز برداری کی منزلوں سے گزرتے، اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید کوئی ان کے پروگرام کی طرف متوجہ کرے کہ انھوں نے اپنا پتہ آپ بتا دیا ہے لیکن پروگرام محض ان کے جسم کی تلاش میں مدد دیتا ہے، ان کی روح اور شخصیت اس میں نہیں ملتی۔ پروگرام پڑھ لیجیے تو میری بات واضح ہو جائے۔

اے شخص اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈھنا چاہے ۔۔۔ وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت ۔۔۔ طرفِ چمن و صحن بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی ۔۔۔ شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مردِ خدا رند خوش اوقات ۔۔۔ رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار ۔۔۔ بزم طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا
اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور ۔۔۔ مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

اس نظم میں محض اس جوشؔ کا جسم ہے جس کی شخصیت کی تلاش ہے، یہ وہ جوشؔ نہیں جو "میں" کہہ کر "کائنات" مراد لیتا ہے اور اسے اپنی انفرادی ذات کے گرد اس طرح محیط کر لینا چاہتا ہے کہ اس کی ذات میں کائنات کی آرزو شامل ہو جائے:

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں ۔۔۔ پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زباں سے "میں" نکلتا ہے ندیم ۔۔۔ اس پردے میں "کائنات" کہتا ہوں میں

اس لیے جوشؔ کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ بات اس وجہ سے اور مشکل ہو جاتی ہے کہ:

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب ۔۔۔ اڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں ایک مائل بہ زمیں ۔۔۔ اور ایک کا رخ ہے آسماں کی جانب

جوشؔ کا اصرار ہے کہ ہر شاعر کے کردار کو اس کے کلام کی روشنی میں مجھا جائے۔ شاید ہی کسی شاعر نے اپنے متعلق اتنا کہا ہو جتنا جوشؔ نے، اس لیے یہ ایک طریقہ ہو سکتا ہے ان کے سمجھنے کا لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہاں افکار کی یکسانی کے لحاظ سے جوشؔ الجھے الجھے نظر آتے ہیں۔ شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے محض یہ کہہ دینا کہ اس میں متضاد عناصر یکجا ہو گئے ہیں ناکافی ہے اور شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ کہہ دینا کہ یہ صرف شاعری ہے درست نہ ہوگا۔ ہمارے خیال میں شخصیت ایک کیمیاوی ترکیب ہے جس میں متضاد اور متخالف عناصر مل کر ایک ہو جاتے ہیں ورنہ وہ چیز وجود میں آتی ہے جسے "بکھری ہوئی شخصیت" کہتے ہیں۔ جوشؔ کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

اے محرمانِ کہنہ دوستانِ نَو ۔۔۔ اک وضع پر نہیں ہے مرے ولولوں کی رَو
کعبے کا نور ہوں تو کبھی بتکدے کی ضَو ۔۔۔ گرتی ہے گاہ برف نکلتی ہے گاہ لَو

دریا ہوں اک مقام پہ رہتا نہیں کبھی
اک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں کبھی

وہ زمزمہ ہوں جس کی نہیں کوئی خاص لَے ۔۔۔ وہ نالہ ہوں کہ ہو نہیں سکتا جو وقفِ نَے
مجھ میں نہاں ہے دہر کی ہر گرم و سرد شے ۔۔۔ زہر و زلال و زمزم و زہرابِ قند و مے

شاعر کا دل فقیر بنے اور لکیر کا
سنگم ہوں رود ہائے حدید و حریر کا

تو یہاں بھی شخصیت کے پارہ پارہ ہونے کی طرف اشارہ نہیں۔ شاعر کی ہمہ گیری اور ہر جہتی نگاہ رکھنے پر فخر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوش کی شخصیت کے بہت سے بھید ان کی شاعری ہی میں کھلیں گے لیکن شاعری بھی تو اس شخصیت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے جسے اور عناصر نے ترتیب دیا ہے۔ شاعری بھی شخصیت کے

رازہائے سربستہ میں سے ایک راز ہے اور غالباً جوشؔ ایسے ہمہ تن شاعر کی شخصیت کا سب سے بڑا راز ـــــ اس لیے ذرا دیر کے لیے ان عناصر پر بھی نگاہ ڈال لینا چاہیے جنھوں نے ان کے ذہن کے ارتقا اور شخصیت کی تشکیل میں حصّہ لیا ہے۔

جوشؔ آفریدی پٹھانوں کے گھرانے میں اس وقت پیدا ہوئے جب انیسویں صدی کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اس دولت و ثروت کا بھی جو کئی پشتوں سے ان کے خاندان کو حاصل تھی۔ جوشؔ کی صورت اور سیرت میں اس "افغانی رگ و پے" کی جھلک اور اثر نمایاں ہے۔ نسلی تعلّق ممکن ہے عام حالات میں اہم نہ ہو لیکن اگر کوئی شخص اسے یاد رکھے، اسے دہراتا رہے، دل ہی دل میں اس پر فخر کرتا رہے تو اس نسلی خصوصیت کا شخصیت اور کردار کا جز بن جانا لازمی ہے۔ جوشؔ اسے نہیں بھولتے کہ وہ کس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی کیا خصوصیات رہ چکی ہیں کسی نہ کسی شکل میں رئیس ابن رئیس ہونے کا ذکر بھی ان کے یہاں آتا رہتا ہے، آبا و اجداد کے صاحبِ سیف و قلم ہونے اور اسی کو اپنا آبائی پیشہ بنانے کا خیال ان کی ابتدائی زندگی میں ان پر مستولی تھا۔ اب بھی جب کبھی جوشؔ کو چھیڑ دیا جائے اور ان کے بزرگوں کا ذکر شروع ہو جائے تو وہ مزے لے لے کر ان کے کردار کے انوکھے پن اور ان کے طرز زندگی کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے دادا محمد احمد خاں کا ذکر کرتے ہوں یا اپنے نانا رستم علی خاں کا، اپنے والد بشیر احمد خاں کا یا اپنے چچا اسحٰق علی خاں کا، ہر ایک کی زندگی ایک دلچسپ داستان کی شکل اختیار کر لیتی ہے بعض حیثیتوں سے یہ انوکھا پن ان کے کردار میں بھی ہے، جسے حالات بدل جانے کے بعد وہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

اس احساس کے بعد اگر بچپن کی فارغ البالی، ناز برداری، حکومت اور طنطنہ، الھڑ بانکپن اور حُسن و محبت کو بھی شامل کر لیا جائے تو اُس جوؔش کی تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے آسکتی ہے جو ان خصوصیات سے تشکیل پانے والی نفسیات کا نتیجہ ہے۔ جوؔش اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے غیر معمولی جنسی جذبہ کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اپنے دادا محمد احمد خاں کی متعدد بیویوں اور بچوں کا ذکر کرتے کرتے کہنے لگے کہ ان کے ایک سَو دس اولادیں ہوئیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ ان کو پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے کہا "جوؔش صاحب! آپ کے بزرگ جنگ آزما سپاہی تھے اور اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ میدان جنگ میں کرتے تھے، آپ کے دادا کے ہاتھ سے تلوار چھن گئی تو انھوں نے اس کا مظاہرہ افزائشِ نسل کے میدان میں کیا، میرا مطلب یہ ہے کہ جنسی خواہش نے بھیس بدل لیا۔" بہت خوش ہوئے تو میں نے ذرا اور خوش کرنے کے لیے اتنا اور جوڑ دیا کہ "آپ میں یہ جذبہ فن شعر گوئی کی طرف مڑ گیا ہے، ہے وہی چیز۔" پھر خوش ہوئے لیکن کچھ سوچ کر ذرا دیر بعد بولے "تو کیا آپ اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ مجھ میں اس جذبہ کی کمی ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔" اور پھر انھوں نے بہت سے قصے بیان کر ڈالے۔ بے تکلف دوستوں کی صحبتوں میں اور دن رات کے مخصوص اوقات میں جوؔش کی گفتگو کا یہ موضوع گفتنی و ناگفتنی دلچسپ لطائف سے بھرا ہونے کے باوجود تھکا دیتا ہے۔

اسی سلسلے میں اگر جوؔش کے اٹھارہ عشقوں کا ذکر کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے عشقوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے "روح ادب" کے دیباچے میں لکھا ہے:

"جی تو بے ساختہ چاہتا ہے کہ میں اس اولین واردات محبت اور اس کے

ساتھ اپنے تمام واقعاتِ رنگیں کو اس دیباچے میں درج کر دوں اور دنیا کو بتا دوں کہ حُسن کی زلفوں کی کمندوں نے کتنی بے پایاں نیازمندیوں کے بعد میرے ناز کو گرفتار کرنے کی سعادت حاصل کی لیکن ڈرتا ہوں ـــــ بیان کرنے سے ڈرتا ہوں ـــــ اپنی رسوائی سے نہیں، اپنے صیادوں کی رسوائی سے ڈرتا ہوں کہ ان کی جبینِ ناز پر شکنیں نہ پڑ جائیں۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے اس موقع پر میں صرف اس قدر کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں محبت کے معاملے میں ہمیشہ خوش قسمت اور عرفیؔ کے اس شعر کا مصداق رہا:

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند

اور یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں آنسو، آہیں اور سینہ کوبیاں بہت ہی کم ہیں کیونکہ یہ چیزیں ناکامی اور انفعالیت سے پیدا ہوتی ہیں اور میں ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں۔"

ایک ذرا سا اقتباس اور ـــــ انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے:

"میری بیشتر عاشقانہ نظموں میں اس چیز کی (لوگ کہتے ہیں) کمی ہے جسے آہ و فغاں اور سوز و گداز کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے میرے عشق ہائے کامراں پر ـــــ میرے اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے رہے ہیں جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ عاشقِ کامیاب ٹسوے نہیں بہایا کرتا اور جس کا یہ دعویٰ رہا کہ:

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید ـــ در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند

اس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ناکامی کے آنسو بہائے ـــــ میں ناکامی کے آنسو لکھ رہا ہوں ورنہ اشک و عشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

یہ خیالات دلچسپ تبصرے کی دعوت دیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ بغیر تبصرے کے بھی یہ بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ صرف ایک بات کی طرف اشارہ کرنا دلچسپ ہوگا۔ جوشؔ نے دونوں مقامات پر عرفیؔ کا جو شعر نقل کیا ہے اور اسکے جو معنی لیے ہیں وہ بھی ان کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اس شعر کے حوالے سے جوشؔ معشوق صفت اور صید افگن بننے کے خواہش مند ہیں حالانکہ عرفیؔ اپنے معشوق کو صید افگن کہتا ہے جو محبوبوں کا محبوب ہے اور جس کے ناوک کی آرزو آہوانِ حرم کو صید کرنے والے صیّاد بھی کرتے ہیں۔ اگر کسی کو جوشؔ کی شاعری میں ان کے اٹھارہ عشقوں کی جستجو کرنا ہو تو غالباً اسے ناکامی ہوگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صرف پہلے اور آخری عشق کے نقوش ان کی شاعری میں واضح ہیں۔ گفتگو میں صرف آخری کے۔

شاعر جوشؔ کے یہاں بھی شخصیت کے اس جارحانہ اظہار کی تصویریں ملتی ہیں جو کبھی کبھی گفتگو میں اپنی جھلک دکھاتی اور طرزِ عمل میں اپنا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ان کی تعلی اور روایتی تعلّی کے انداز سے مختلف اور شاعری کے متعلق ان کے خیالات دوسرے شعرا سے مختلف ہیں۔ انھوں نے نو برس کے سن سے شعر کہنا شروع کیا۔ مکتب میں کتابوں کے حاشیوں پر شعر لکھے، امتحان کی کاپیوں پر شاعری کی۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"نو برس کی عمر سے شعر نے اپنے کو مجھ سے کہلوانا شروع کیا۔"

(یہاں بھی جبر کی کارفرمائی جس کا ذکر آگے آئے گا) کہتے ہیں کہ:۔

"جب میرے دوسرے ہم سن بچے پتنگ اڑاتے اور گولیاں کھیلتے تھے اس وقت کسی گوشے میں شعر مجھ سے اپنے کو کہلوایا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں وغیرہ کھیلنے کے فن سے میں اب تک ناواقف ہوں۔"

گھر پر ہر وقت شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ ادبی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ وحید الدین سلیم پانی پتی اکثر ملیح آباد میں جوش کے والد کے مہمان رہتے تھے۔ اس لیے جوش کے لیے محرکات شاعری کی کمی نہ تھی۔ ہاں ان کے والد البتہ یہ چاہتے تھے کہ شاعری کرنے کے بجائے ان کا بچہ کسی کام کا بنے۔ چنانچہ وہ انھیں شاعری سے روکتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے جاسوس مقرر کر دیے تھے کہ جوش (اس وقت شبیر حسن خاں شبیر تھے) کو شعر کہتے پائیں تو مطلع کریں۔ اس خبر رسانی پر جاسوس کو انعام اور انھیں جھڑکیاں ملتی تھیں۔ جوش نے خود بتایا کہ ایک زمانے میں یہ کام داروغہ حامد علی کے سپرد تھا، ہر دفعہ خبر پہنچانے پر انھیں پانچ روپے ملتے تھے۔ انھوں نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے جھوٹی سچی خبریں پہنچانا شروع کر دیں، مجھے جہاں تنہا دیکھتے فوراً والد کو جا کر مطلع کرتے کہ "میاں! شبیر حسن خاں شعر کہہ رہے ہیں۔" انھیں پانچ روپے مل جاتے اور مجھے تنبیہہ —— اس طرح جوش نے شاعری شروع کی۔ جب باپ نے دیکھا کہ اب انھیں روکا نہیں جا سکتا تو خود اپنے ساتھ لا کر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے سپرد کر دیا جو لکھنو کے بڑے خوش فکر شاعر تھے۔

تخلص شبیر سے کس طرح جوش ہوا یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ اس کے متعلق جوش نے ایک دفعہ خود کہا:۔

> "ابتدائے شباب اور شاعری کا زمانہ تھا، لکھنؤ میں قیام تھا، شہر میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی، رات گئے چند دوست تھیٹر دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ اس خوبصورت ایکٹرس کا ذکر تھا جس کے حسن سے سب متاثر تھے۔ کچھ شعر پڑھے جا رہے تھے، دورانِ گفتگو میں کسی نے کہا ہم لوگ بڑے جوش میں ہیں، بس نہ جانے کیسے یہ طے ہو گیا کہ میرا تخلص اب شبیر کے بجائے جوش ہو گا۔"

معلوم نہیں یہ رائے کس نے دی تھی لیکن جس نے بھی یہ سوچا ہوگا اس نے جوؔش کی ابتدائی شاعری میں اس رومانی وفور کو دیکھا ہوگا جس نے کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

بہرحال جوؔش نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور بہت معمولی وقفوں کو چھوڑ کر ہمیشہ ایک تپسیا کرنے والے کی طرح شاعری کی دیوی کے قدموں پر پھول چڑھاتے رہے ہیں۔ وہ روزی کے لیے کسی قسم کا کام بھی کرنے پر مجبور ہوئے ہوں لیکن سب سے پہلے وہ شاعر ہیں پھر کچھ اور۔ شاعری ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ سانس لینے کی طرح ناگزیر ـــــ ان کی زودگوئی بعض اوقات حیرت انگیز شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس حالت میں وہ اس قدر غیر واضح لکھتے ہیں کہ ان کی تحریر کا پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو اس وقت جوؔش کچھ دنوں کے لیے اپنے ملیح آباد کے مکان "قصر سحر"، میں مقیم تھے، کبھی کبھی لکھنؤ آتے تھے۔ ایک دن وہاں سے چلے تو سیدھے میرے یہاں آئے اور خلاف معمول جیب سے ایک کاپی نکال کر کہنے لگے، رات ایک نظم ہوگئی ہے اور محض دس منٹ میں، ذرا سنیے تو ــــ یہ نظم تھی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے"، میں نے سوچا اس کی ایک نقل لے لوں ممکن ہے ضبط ہوجائے اور پھر نہ ملے، چنانچہ بغیر جوؔش کی مدد کے اس کا لکھنا ناممکن ہوگیا۔ یہ بھی لکھ دوں کہ جوؔش "نیا ادب"، کے دفتر گئے، وہاں مجاز، سبط حسن اور سردار جعفری نے ان سے یہ نظم لے کر "نیا ادب" میں شایع کردی اور رسالہ کا وہ نمبر ضبط ہوگیا۔

یہ زودگوئی جذباتی ابال کی بھی غمازی کرتی ہے۔ جس وقت جو جذبہ ان پر طاری ہوتا ہے اس وقت وہی ان کے لئے ساری شاعرانہ صداقتیں رکھتا ہے اور وہ اس کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ جب اس جذبہ کی شدت

کی بنا پر کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو ان کی ذہانت اور طباعی ان کے لیے استدلال بھی تلاش کر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ جذباتی نتائج کو منطقی نتائج سمجھنے لگتے ہیں۔ جس شخص نے جوش سے علمی مسائل پر گفتگو کی ہے وہ ان کے خیالات میں یہ خصوصیت ضرور دیکھے گا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پوری توجہ سے یا دلچسپی سے گفتگو ہی نہ کر رہے ہوں۔ اگر ان کو کسی طرح یہ اندازہ ہو جائے کہ گفتگو کرنے والا ذہین نہیں ہے گفتگو کے لیے گفتگو کرنا چاہتا ہے، مقصد وقت گزاری ہے تو پھر ان کی گفتگو یونہی ہو سکتی ہے، ہو سکتا ہے کہ گفتگو کرنے والے کی صورت یا آواز انھیں اچھی نہ معلوم ہوتی ہو۔ اس کے ساتھ کوئی ایسا آدمی ہو جو انھیں ناپسند ہو یا اس شخص کو کبھی انھوں نے ایسے آدمی کے ساتھ دیکھا ہو جو معقول نہ ہو۔ ان تمام حالات میں ان کی گفتگو ٹالنے اور مناسب جوابات سے بچنے کی ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت بات چیت میں طنز اور کڑواپن زیادہ ہو۔ اگر جوش کا جی لگ جائے، موضوع علمی یا ادبی ہو تو اکثر ان کی باتیں بہت دلکش اور شگفتہ ہوتی ہیں اور گفتگو کرنے والا مایوس نہیں ہوتا۔

جوش کی شراب نوشی کا مطالعہ بھی کئی پہلو رکھتا ہے۔ اس کے کچھ آداب وضوابط ہیں، معین وقت ہے، تقریباً معین نشہ کی کیفیت ہے۔ مخصوص لوگوں کے ساتھ پینے میں مختلف کیفیتیں وابستہ ہوتی ہیں، شراب بنتی ہے، بگڑتی ہے، بولتی ہے، خوب بولتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ بعض اوقات صحبتیں خراب ہو جاتی ہیں، بعض اوقات یادگار بن جاتی ہیں۔ جوش نے متعدد مقامات پر اور متعدد اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے کہ جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو میں پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں اس کا اثر سہ پہر ہی سے شروع

ہوتا ہے۔ انتظامات ہونے لگتے ہیں اور سب تیار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر جام میں شراب انڈیلی جاتی ہے اور " بنام فلاں بن فلاں " دور چلنے لگتے ہیں۔ باتیں ہر سطح پر پہنچتی ہیں اور جوش بزم کے صدر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس بزم میں سب سے زیادہ احمق وہ شخص سمجھا جاتا ہے جو محض تماشائی ہو، کبھی کبھی وہ طنز اور استہزا کا نشانہ بنتا ہے، کبھی اس پر رحم کھایا جاتا ہے، کبھی اس کی بزدلی پر افسوس۔ ایسی مجلسوں میں ہر قسم کا ظرف رکھنے والے ہوتے ہیں۔ کوئی دو ہی جام میں چھلک کر بے کار ہو جاتا ہے کوئی دیر تک جوش کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ احتیاط سے پیتے ہیں اور عام طور سے مدہوش نہیں ہوتے۔ ایک بار ایک ایسی ہی محفل میں جو کئی پینے والوں کو مستی کے اس عالم میں پہنچا چکی تھی جہاں صرف وہی ہوتے ہیں، میں نے محسوس کیا کہ جوش بھی بہک رہے ہیں۔ وہ کھڑے ہوئے تو بار بار قدم ادھر ادھر پڑ رہے تھے۔ ایک دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے وہ گر رہے ہیں۔ میں نے ہاتھ پیٹھ پر رکھ کر اپنے خیال میں انھیں سنبھالنا چاہا، جوش نے قہقہہ لگایا اور کہا میں بالکل حواس میں ہوں، آپ کو آزما رہا تھا کہ آپ حواس میں بھی میری مستی کا اندازہ لگا سکتے ہیں یا نہیں۔ اس بزم ناؤ نوش کی حیثیت کبھی کبھی دربار کی سی ہو جاتی ہے۔ لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، باتیں کرنا تمام چیزیں ایک خاص نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ میں اکثر اس دربار کی رونق کو برہم کرنے کا جرم کر دیتا ہوں اور دلچسپ فقرے سنتا ہوں لیکن اس بزم میں جوش اپنی تازہ ترین اور پسندیدہ نظمیں سناتے ہیں، دوسروں کے اچھے اشعار پڑھتے ہیں۔ اشعار کی بعض خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور داد چاہتے ہیں۔ وہاں سبھی مصرعے اٹھاتے ہیں اور سبھی فردوسی اور رودکی کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں، سبھی سخن شناس معلوم ہوتے ہیں اور سبھی جی

کھول کر داد دیتے ہیں۔ یہاں نظموں کی تنقید نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کی حیثیت پست ہوتی ہے اور جوشؔ غیر معمولی نشاط اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ اگر اس محفل میں کوئی ایسا ہوا جو "نامطبوع" ہے یا جوشؔ کا جی نہ چاہتا ہو تو ننانوے فیصدی ایسا ہوتا ہے کہ جوشؔ کوئی نظم نہیں سناتے۔

جو شخص جوشؔ کی مکمل سوانح عمری لکھے گا وہ اس مجلس سے نتائج اخذ کرے گا اور اس کی تفصیلات پیش کر کے جوشؔ کے کردار پر روشنی ڈالے گا کیونکہ یہاں کے لطائف و ظرائف لوگوں کے متعلق رائیں، ماضی کی طرف بازگشت اور بیتی ہوئی یادوں کے تذکرے سب معنی خیز ہوتے ہیں۔ جوشؔ مستقبل سے زیادہ ماضی کے نقوش ابھار سکتے ہیں اور جب عالم کیف میں میں گزرے ہوئے دن نگاہوں کے سامنے رنگین تصویریں بنا رہے ہوں اس وقت معمولی معمولی اشاروں میں بھی جوش بہت سی کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان باتوں کو بدحواسی کی گفتگو سمجھنا درست نہ ہوگا کیونکہ میں نے وہی باتیں اور تقریباً انھیں الفاظ میں دوسرے اوقات میں بھی ان سے سنی ہیں۔

خیر تو مستی اور ہوش کے عالم میں جوشؔ کی حالت میں کوئی بڑا فرق اس کے سوا نہیں ہوتا کہ رات کو ان کے موضوعاتِ گفتگو محدود ہو جاتے ہیں اور کچھ الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتنے لگتے ہیں۔ حالانکہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب کبھی ایسی صحبتوں میں ڈاکٹر رشید جہاں مرحومہ یا ہاجرہ بیگم یا کوئی ایسی ہی ذی وقار خاتون موجود ہوئیں تو جوشؔ کبھی سنجیدگی نہیں کھوتے تھے، ویسے ان سے بدحواسیاں تو ایک خاص رنگ میں ہوش و حواس کے عالم میں بھی سرزد ہوتی ہیں جن میں سے چند کا ذکر انھوں نے اپنے رسالہ کلیم میں بھی کیا تھا لیکن ان کا تعلق ایک طرح کی شاعرانہ خود فراموشی سے ہے۔

ایک اور ضروری اور اہم پہلو ـــــــ جوشؔ نے اپنے بچپن کے واقعات میں ایک ایسے رجحان کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ان کے کردار پہ تیز روشنی پڑتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:۔

> "شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین مشغلہ تھا کہ ایک اونچی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو جو بھی جی میں آتا تھا اناپ شناپ درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پہ ایک پتلا سا بید رکھا رہتا تھا اور جو بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا اسے میں بید سے اس بری طرح مارتا تھا کہ بے چارہ چیخیں مار مار کر رونے لگتا تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کند ذہن بچے کے کاندھوں پہ سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر دوڑاتا تھا کہ وہ غریب بے دم ہو کر گرنے لگتا اور میرے مزاج کی یہی وہ بنیادی سختی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ و ترش بن کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے اور میری شاعری کا نقاد میرے لہجے کی درشتی پر چیخ چیخ اٹھتا ہے۔"

یہ اقتباس دلچسپ حقائق کا حامل ہے۔ میرے خیال میں صرف اتنی ہی بات نہیں ہے۔ بچپن میں درس دینے کا مشغلہ، بڑی عمر میں پیمبری اور رہبری کی خواہش میں تبدیل ہو گیا ہے۔ بچپن میں جو بچے درس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے وہ سزا پاتے تھے اور آج جو لوگ جوشؔ کی شاعری پہ دھیان نہیں دیتے انھیں جوشؔ اپنے مخصوص انداز میں گونگا، بہرا، اندھا، جاہل اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں۔ مثلاً:۔

اندھوں سے جب پڑا ہو زمانے میں سابقہ   اے جوشؔ آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا

حیف صد حیف کہ قدرت سے ملا ہے یہ حکم   بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

اس کے علاوہ بید مارنے میں بھی گہرے نفسیاتی رموز ہیں جن میں سے بعض

طنز، صاف گوئی، نازک مزاجی، سریع الحسی اور کسی حد تک ایذا دہی میں لذت اندوزی کے جذبات کی شکل میں آج بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ پہلو روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔ طنز، شاعری اور گفتگو میں زیادہ جگہ پانے لگا ہے۔ احساس برتری رسمی تعلی کے پردوں کو چیر کر نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ یہ احساس برتری محض ایک نفسیاتی کیفیت نہیں ہے۔ حالات نے انھیں اس کا موقع بھی دیا کہ وہ بچپن سے اس وقت تک اس کو اپنے رگ وپے میں محسوس کریں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ چاہے جن دوسرے عناصر نے یہ بات پیدا کی ہو لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے ان میں یہ خود اعتمادی، خود بینی اور احساس فخر پیدا کیا وہ ان کی شاعری ہے، اسی چیز نے انھیں حیدرآباد میں عزت بخشی۔ اسی نے انھیں ہندوستان کے مختلف حلقوں میں سربلند کیا اور اسی نے انھیں یہ موقع دیا کہ وہ بے جھجک، وقت بے وقت پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے صاف صاف باتیں کر آتے اور وہ ان کے غرور شاعرانہ کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے تھے۔ جو کچھ بھی ہو، شاعری نے ان کے مزاج میں ایک بانکپن اور شخصیت میں ایک دلکشی پیدا کی ہے جس کی وجہ سے ان کے نازنیں بننے اور ناز برداری کرانے کی تمنا پوری ہوتی رہتی ہے۔

شدتِ جذبات اور سریع الحسی نے جوشؔ میں بہت سے متضاد عناصر پیدا کر دیے ہیں اور چونکہ وہ سب باتیں ان کی شاعری اور گفتگو میں نمایاں جگہ پا چکی ہیں اس لیے جوشؔ ان سے دست بردار بھی نہیں ہوتے، گو تفکر انھیں بچپن سے عزیز رہا ہے اور انھوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے منطقی نہیں ہے۔ ان کی منطق بھی جذبات ہی کی گود میں پرورش پاتی ہے، مذہب، خدا، حیات بعد موت، جبر و اختیار، مقصد حیات، علم انسانی،

عقل و عشق، جنون و حکمت ان تمام مسائل پر انھوں نے غور کیا ہے اور حسین ترین شاعرانہ انداز میں ان کے نازک مقامات کو پیش کیا ہے لیکن ہر مقام پر عقل و جذبہ کی آویزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوش کو شاعر جوش نے اکثر شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مطلق جبر کے قائل ہیں اور دوسری طرف انسان کو عمل پر اکساکر خدا بننے اور کائنات کی تشکیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں/اور یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں باتیں جبر کے تحت ہو رہی ہیں۔ یہاں ان کے خیالات اور معتقدات کی بحث بے محل ہو گی۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جوش جذبے کی والہانہ تندی اور شدت کی گرفت میں اس طرح آجاتے ہیں کہ ان کی شعوری کوششیں بھی اسی رنگ میں رنگ جاتی ہیں، اس میں ان کے خلوص یا ان کی صداقت پر حرف نہیں آتا۔

اس جذباتیت کی بہت سی مثالیں ان کی زندگی سے دی جا سکتی ہیں۔ وہ ہر شخص کی سفارش کرنے کو تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس میں انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ ایک ہی جگہ کے لیے کئی آدمیوں کے لیے سفارش کر رہے ہیں۔ جوش مردم شناس نہیں ہیں، انھیں اس میں دھوکا ہوتا رہتا تھا لیکن جب وہ ایک دفعہ ایک رائے قائم کر لیتے ہیں تو اس کی مخالفت پچاس دلیلیں اور واقعات بھی ان کے پہلے نقش کو مٹا نہیں سکتے۔ اس میں ان کی کوئی غلطی یا بدنیتی شامل نہیں ہوتی۔ اس جذباتیت کی ایک اور شکل کبھی کبھی یادگار حیثیت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے مسلم بورڈنگ ہاؤس میں وہاں کا شاندار سالانہ مشاعرہ تھا، یہ مشاعرہ برسوں سے ہوتا آیا تھا۔ ایک طرف چلمن ڈال کر کچھ عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام ضرور کر دیا جاتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ خواتین مردوں کی

طرح صف میں بیٹھ کر مشاعرہ سنیں۔ اتفاق سے اس دن الہ آباد میں ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر رشید جہاں مرحومہ ان کی بہنیں اور بعض دوسری خواتین موجود تھیں۔ ان لوگوں نے مشاعرہ میں شرکت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ معلوم ہوا کہ چلمن کے پیچھے بیٹھ کر سنیں تو سنیں ورنہ مجبوری ہے۔ ان لوگوں نے جوشؔ سے کہا کہ ہم تو سامنے ہی بیٹھ کر سنیں گے، آپ کچھ مدد کیجیے۔ جوشؔ نے منتظمین سے کہلا بھیجا کہ جب تک ان خواتین کو مشاعرے میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے گی میں شریک نہیں ہوں گا۔ تھوڑی دیر بعد مشاعرے کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے اور بہت سے شعراء ان کی وجہ سے باہر ہی رہے، اچھی خاصی ہلچل رہی۔ یہاں تک کہ ان خواتین کو مشاعرے میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ یہی زمانہ تھا جب انھوں نے اپنی نظمیں "خاتونِ مغرب" اور "خاتونِ مشرق" لکھی تھیں۔ اب تو جوشؔ ان نظموں کو ایامِ جاہلیت کی نظمیں کہتے ہیں اور سماج میں عورت کے مقام کے متعلق ان کے خیالات میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں لیکن اس کا اظہار ابھی تک واضح شکل میں صرف "حرفِ آخر" کے ایک مقام پر ہوا ہے جس سے بہت سے لوگ واقف ہیں۔ جوشؔ میں عجیب طرح سے ایک بت پرست اور بت شکن کی روحیں مل گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، اپنی ایک رباعی میں وہ لکھتے ہیں:

عفریت، خبیث، دیو، اژدر، شیطاں
درویش، اقطاب، امام، مرسل، یزداں
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خرد شاں و تپاں

جوشؔ کا سینہ کتنے متضاد اور متصادم عناصر کی جولاں گاہ ہے، کیا ان کی

شخصیت میں ان کا اظہار نہیں ہوگا؟ پھر کیا جوش کی شخصیت ایک پارہ پارہ بیمار شخصیت ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے، ان کا کردار ایک ایسے ذہین، ذکی اور زود حس انسان کا کردار ہے جو عمل میں کم اور خیال میں زیادہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے یعنی ان کا ذہن جن تاثرات کو بجلی کی طرح قبول کر لیتا ہے ان کا اظہار ان کے تخیلی کارناموں میں فوراً ہو جاتا ہے چاہے عمل میں نہ ہو سکے۔ یہ چیز ان کے افتاد مزاج سے ہم آہنگ ہے کیونکہ ان میں ناز برداری کے متمنی ایک عیش پسند کی روح ہے جس کا بچپن پھولوں کی سیج پر گزرا، جو محبت میں کامیاب رہا، جس نے اپنی راتیں زلفوں کے سایہ میں گزاریں، جو اپنے حسب توقع نہ سہی پھر بھی ملک کی ایک متاعِ عزیز بننے میں کامیاب ہوا۔ جوش کی عملی اور خیالی زندگی میں یہ تضاد حقیقتاً جنون و حکمت کی کشمکش کا وہی پہلو پیش کرتا ہے جو ہر ایسے حساس انسان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے جسے عمل کی زندگی میں وہ سب کچھ کرنے کا موقع نہیں ملتا جو وہ سوچتا ہے یا سوچ سکتا ہے، سریع الحسی جلد باز بناتی ہے، جوش بھی بہت جلد نتائج تک پہنچنا چاہتے ہیں، جو باتیں ان کے جذبات سے ہم آہنگ ہوں انھیں وہ جلد قبول کر کے ایک نئی قوت سے پیش کرتے ہیں۔ ان پہلوؤں کو نہیں دیکھ سکتے جنھیں دوسرے دیکھ سکتے ہیں اور دوسرے نتائج نکال سکتے ہیں۔

ان حالات میں اگر جوش کی شاعری اور کردار کو سمجھنے میں الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے، ان کے مذہبی اور سیاسی معتقدات محض ایک ذہنی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں، ان کی سماجی زندگی، وضع کی پابندی اور آزادی کی آمیزش کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ ان کی گفتگو بھولے پن اور

دیوانہ بکار خویش ہشیار دونوں کیفیات سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے دو چار ملاقاتوں میں انھیں سمجھنا آسان نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں جلدبازی مفید نہ ہوگی۔ ان میں ضد اور فراخ دلی دونوں ہیں۔ اس لئے ان سے گفتگو کرنے میں بے صبر ہونا ان کے تہاں خانۂ دل تک نہیں پہنچا سکے گا۔ بعض باتیں وہ بڑی آسانی سے مان لیں گے، اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوگی اور بعض اوقات بہت سیدھی سی بات پر گھنٹوں اڑے رہیں گے، یہاں تک کہ جو انھیں نہیں جانتا بڑی الجھن میں مبتلا ہو جائے گا۔ جوشؔ زود رنج بھی ہیں لیکن ان کی خفگی میں کبھی بغض و عناد یا دشمنی کی جھلک نہیں پیدا ہوتی۔ اگر وہ آپ سے خفا ہیں تو اپنی ناراضگی برابر یاد دلاتے رہیں گے لیکن یہ ناراضگی کبھی بے تعلقی کی شکل اختیار نہیں کرے گی۔ ان تمام اداؤں میں ایک پرخلوص آنکھ مچولی کی کیفیت رونما ہوتی رہتی ہے۔ اس کھیل کے جاری رکھنے میں انھیں مزا بھی آتا ہے اس لیے ان کی دوستی مسلسل آزمائش کا شکار رہتی ہے۔

جوشؔ کے یہاں رازوں کا گزر نہیں، اپنی جنسی، خانگی، سماجی اور ادبی زندگی کے متعلق وہ تقریباً سب کچھ بتا دیتے ہیں اور انھیں کی بنیاد پر دوسروں کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں جن کا درست ہونا ضروری نہیں۔ اس طرح زندگی کے کھلی ہوئی کتاب ہونے کے باوجود جوشؔ کی شخصیت کے سمجھنے میں جو دشواری ہوتی ہے اس کا سبب ان کی جذباتیت اور شاعرانہ افتاد مزاج ہے۔

شعلے

شعلے

نیا میلاد

(۱)

اب سے تقریباً بچھتر سال پہلے ہمنشیں
مبتلا تھی سخت تشویش و تذبذب میں زمیں

دہر کا بوڑھا تمدن مل چکا تھا خاک میں
اور جواں دستور گم تھا محبس ادراک میں

خاک پر رکھی ہوئی تھی کہنہ قدروں کی جبیں
اور نئی قدریں تھی قصر ذہن میں خلوت نشیں

خستہ جاں تہذیب آتاری جا چکی تھی قبر میں
اور نئی تہذیب مضمر تھی حجاب ابر میں

پشت پر ٹوٹی پڑی تھیں کچھ پرانی سیڑھیاں
اور آگے کوئی رہبر تھا، نہ کوئی نردباں

دین کے دھارے کے اندر بجلیوں کی رو نہ تھی
اور بے دینی میں شفاف و نمایاں ضو نہ تھی

ہو چکا تھا پوچ و مہمل حرفِ آئین قدیم
اور جدید اخلاق تھا زیر حجاباتِ عظیم

بے ضیا پیغمبری تھی، کافری تاریک و تار
کس غضب کی کشمکش تھی، کس بلا کا انتشار

بن چکا تھا نظم امروز ایک برق امن سوز
اور تھا دستورِ فردا کارخانے میں ہنوز

کہنگی بے روح تھی اور جدتیں بے برگ و بار
وہ ادھر مجبور تھی، اور یہ ادھر بے اختیار

وہ ترازو تولتی تھی جو حقائق کو کبھی
وقت کے گھن سے پڑی تھی خاک پہ ٹوٹی ہوئی

عالم ماضی، بطون گور کی پستی میں تھا
عالم آئندہ، بطنِ شاہدِ ہستی میں تھا

نسلِ انسانی کھڑی تھی ششدر و آتش بجاں
اک عبوری موڑ پر، دو عالموں کے درمیاں

کہنہ عالم میں حیات آمیز رقص و رم نہ تھا
جلد پیدا ہو، نئے عالم میں اتنا دم نہ تھا

(۲)

آج لیکن عصر حاضر کا سماں کچھ اور ہے
اب زمیں کچھ اور ہے، اب آسماں کچھ اور ہے

ہاں وہی عالم کہ تھا مدت سے جس کا اشتیاق
آج پیدا ہو رہا ہے باہزاراں طمطراق

جن کو یہ ڈر ہے کہ یہ مولود ہو گا نا سعید
ان کے اوج ذہن پر ہے پرتو وہم شدید

اور جو کہتے ہیں جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
کہہ دو، چپ ہو جائیں اک جشنِ دگر ہونے کو ہے

آج جو چھایا ہوا ہے زندگی پر یہ دھواں
اس دھویں میں پرفشاں ہیں سیکڑوں رنگینیاں

اس شبِ جامد میں صبحِ سیلِ احساسات ہے
اب بھی مانا رات ہے لیکن یہ پچھلی رات ہے

شب کے اس دھندلے افق سے باہزاراں آب و تاب
امن و آسائش کا طالع ہو رہا ہے آفتاب

تیز تلواروں سے ہو کیوں عصرِ نو چیں بر جبیں
یہ تو اس موسم کے پھل ہیں، تیز تلواریں نہیں

ان پھلوں کو آدمی چکھ کر امر ہو جائے گا
آفتابِ حسب انساں جلوہ گر ہو جائے گا

اک انوکھی ضو سے دنیا جگمگا دی جائے گی
شمع برتر آدمیت کی جلا دی جائے گی

کہہ رہا ہے صاف لفظوں میں زمیں کا خلفشار
دردِ زہ میں مبتلا ہے مادرِ لیل و نہار

ہل رہا ہے یہ جو توپوں کی گرج سے آسماں
یہ تو ہے دراصل وضعِ حمل کی آہ فغاں

جس کو ہو اسقاط کا اندیشہ وہ دیوانہ ہے
یہ حضورِ ارتقا، اک حرفِ گستاخانہ ہے

جنگ کی بھٹی سے آنے ہی پہ ہے بادِ مراد ارتقا پائندہ باد و نوعِ انساں زندہ باد

آچکی ہے نقطۂ تکمیل پر حیوانیت دیکھ پیدا ہو رہی ہے، اک جدید انسانیت

پرتوِ تائید ہے اس پردۂ تردید میں ایک صالح زندگی ہے معرضِ تولید میں

آ رہا ہے تازہ وارث، عالم ایجاد کا
جلد تر اعلان کر دو اک نئے میلاد کا

باغی انسان

حکمراں آج بھی ہیں پیرِ مغاں کیا کہنا وہی دفتر ہے وہی مُہر و نشاں کیا کہنا

عقل کی تند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے پھر بھی ہے شمعِ جنوں شعلہ فشاں کیا کہنا

کب سے تقویٰ ہے مزامیر و ترنم کے خلاف آج بھی نغمہ ہے آشوبِ جہاں کیا کہنا

کب سے خورشید کی حدّت میں ہے فرمانِ سکوت پھر بھی جنبش میں ہے ذرّوں کی زباں کیا کہنا

ذرّے ذرّے پہ جہنم کی لگی ہیں مہریں پھر بھی دنیا پہ ہے جنّت کا گماں کیا کہنا

کب سے ادیان کی خشکی میں ہے تبلیغِ سراب وہی رونق ہے سرِ آبِ رواں کیا کہنا

عقل کے دور میں بھی عشق نہیں ہے خاموش وہی نالے ہیں وہی شور و فغاں کیا کہنا

کب سے ہے ذوقِ نظر، حکمِ شریعت سے حرام ۔۔۔ وہی نظریں ہیں وہی حسنِ جواں کیا کہنا
آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلبگاری ہیں ۔۔۔ چشمِ انساں ہے بہر سو نگراں کیا کہنا
ہاں بہ ایں شدتِ آیات و احادیثِ حجاب ۔۔۔ دستِ خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا
شبنم و برف کے اس حلقۂ نمناک میں بھی ۔۔۔ اٹھ رہا ہے دلِ انساں سے دھواں کیا کہنا
ترش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے ۔۔۔ پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا
زہر کے کوڑے ہلاکت میں بھی ہیں گرمِ خرام ۔۔۔ زلف بر دوش مسیحا نفساں کیا کہنا
کب سے قرنوں کا ہے شانوں پہ اٹھائے ہوئے بار ۔۔۔ پھر بھی رقصاں ہے جہانِ گزراں کیا کہنا
سینۂ دہر ہے گو تیرِ حوادث سے فگار ۔۔۔ پھر بھی ابرو کی لچلتی ہے کماں کیا کہنا
کب سے ہے نطقِ رسالت پہ رواں ہجوِ شراب ۔۔۔ وہی ہلچل ہے سر کوئے مغاں کیا کہنا
للہ الحمد کہ خود حکمِ "خدا" کے باوصف ۔۔۔ ہے وہی گرمیٔ بازارِ بتاں کیا کہنا
آفریں باد کہ اس جبرِ مشیت پہ بھی ہے ۔۔۔ دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی، سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

بغاوت

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت، آندھی میرا نام   میرے گرد و پیش اجل، میری جلو میں قتلِ عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات   کانپ اٹھتی ہے مری چینِ جبیں سے کائنات
جنگ کے میداں میں میری سیف کی اللہ ری ضَو   خاک بن جاتی ہے بجلی، برف دے اٹھتی ہے لَو
ذکر ہوتا ہے مرا پُرہول پیکاروں کے ساتھ   ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
اللہ اللہ کروٹیں میرے دلِ آزاد کی   جن سے گر جاتی ہیں ڈاٹیں قصرِ استبداد کی
میری اک جنبش سے ہوتا ہے جہاں زیر و زبر   میری سرتابی ثریا کا جھکا دیتی ہے سر
ایک چنگاری مری جنت کو کرتی ہے تباہ   مانگتا رہتا ہے میری آگ سے دوزخ پناہ
الحذر! میری کڑک کا زور ہنگامِ مصاف   صاف پڑ جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف
اللہ اللہ بزمِ ہستی میں مری گلباریاں   ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو، ریزہ ریزہ استخواں
الامان والحذر! میری کڑک، میرا جلال   خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں، کٹار   بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہسوار
آندھیوں سے میری اڑ جاتا ہے دنیا کا نظام   رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام

موت ہے خوراک میری، موت پر جیتی ہوں میں
سیر ہو کر گوشت کھاتی ہوں، لہو پیتی ہوں میں

پیاس سے باہر نکل پڑتی ہے جب میری زباں
بہنے لگتی ہیں سرِ میداں لہو کی ندّیاں

جنگ کی صورت سے گو ہنگامہ کرتی ہوں شروع
امن کی صبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلوع

میرا مولد مفلسی کا دل ہے عُسرت کا دماغ
میری پیدائش کے حجرے میں نہیں جلتا چراغ

گود میں ناداریوں کی پرورش پاتی ہوں میں
بے زری کے بازوؤں پر زلف بکھراتی ہوں میں

بھوک سے ہر چند کیا کیا سرگراں ہوتی ہوں میں
بھوک ہی کا دودھ پی پی کر جواں ہوتی ہوں میں

گرم نالے منہ اندھیرے سے جگاتے ہیں مجھے
اشکِ غم ہر صبح آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

مجھکو بچپن کے زمانے ہی سے ہر صبح و مسا
پیٹ کی ماری ہوئی مخلوق دیتی ہے غذا

جس کو حاصل زندگی کا کچھ مزا ہوتا نہیں
کچھ کبھی جس کے پاس ماضی کے سوا ہوتا نہیں

جس کی چشمِ تر میں یوں کھاتے ہیں ارماں پیچ و تاب
دھار پر تلوار کی جیسے شعاعِ آفتاب

ختم ہو جاتا ہے جب اہلِ جہاں کا غلغلہ
رات کے آغوش میں کھلتا ہے میرا مدرسہ

کھل کے پوری سانس لینے سے بھی گھبراتی ہوں میں
درس لینے کے لیے پنجوں کے بل جاتی ہوں میں

ہر قدم پر بھوت آوازیں سناتے ہیں مجھے
تیرہ دیواروں کے سائے تک ڈراتے ہیں مجھے

ایک دنیا سے نرالی ہے مرے مکتب کی شان
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں اور کھلے رہتے ہیں کان

بستۂ قرطاس ہو سکتی نہیں میری کتاب
خون کی چادر پہ چھپتا ہے مرا خونی نصاب

اف! در و دیوار میرے مدرسے کے الاماں!
درس دیتی ہیں جہاں سہمی ہوئی سرگوشیاں

دیکھنے سے جن کے پتھر کا بھی دل ہو جائے شق
مجھکو وہ اترے ہوئے چہرے پڑھاتے ہیں سبق

اول اول جان دینے کا سبق لیتی ہوں میں
آخر آخر جان لینے کا سبق لیتی ہوں میں

کچھ دنوں تو فرطِ حیرت سے میں رہتی ہوں خموش
آخر آ جاتا ہے میری روحِ سیمابی کو جوش

پھر تو میں چنگھاڑتی ہوں خوفناک انداز میں
موت کی آواز ہوتی ہے مری آواز میں !

برق کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں گفتاریں مری
میان سے باہر ابل پڑتی ہیں تلواریں مری

موت بن کر زندگی کے سر پہ چھا جاتی ہوں میں
سب سے پہلے بڑھ کے غداروں کو کھا جاتی ہوں میں

سوزِ ملت سے جو پہلو مشتعل رکھتے نہیں
ہاں وہی غدار، سینوں میں جو دل رکھتے نہیں

سلطنت کی سمت پھر بڑھتی ہوں بل کھاتی ہوئی
قید اور قانون کو ذلت سے ٹھکراتی ہوئی

اپنی رَد کی گرد میں صحن زمیں الٹے ہوئے
میان سے خنجر نکالے، آستیں الٹے ہوئے

باندھتی ہوں شہریوں کے سر پہ یہ کہہ کر کفن
تم ہو اشجع، ناوک افگن، صف شکن، شمشیر زن

تم ہو غازی، جنگجو، لشکر شکن، میرِ سپاہ
تم ہو رستم، مردِ میداں، شیر دل، عالم پناہ

تم ہو سر لشکر، سپاہی، برق پیما، سخت کوش
تم ہو صفدر، سورما، ساونت، سرکش، سرفروش

ایڑیاں تم اور رگڑو آب و ناں کے واسطے
ریڑھ کی ہڈی ہو تم جسمِ جہاں کے واسطے

اے جواں مردو! یہ ذلت کس لیے سہتے ہو تم ؟
مرد ہو کر ٹھوکروں کی زد پہ کیوں رہتے ہو تم ؟

مادہ سیرت بن کے تو رہتے نہیں دنیا میں نر
ٹھوکروں کے واسطے ہوتا نہیں مردوں کا سر

لختِ دل انسان کھائے اور خونِ دل پیے
تف ہے اس جینے پہ مر مر کے جیے تو کیا جیے

سچ کہو تم ننگِ محکومی سے شرماتے نہیں ؟ — کیا تم اپنی عورتوں کے سامنے جاتے نہیں ؟

کب نکالو گے تمنائیں دلِ برباد کی ؟ — کیا ہوئیں تیغیں تمھارے نامور اجداد کی ؟

اے جواں مردو! خدارا باندھ لو سر سے کفن — سر برہنہ پھر رہی ہے عزتِ قوم و وطن

ہاں زمیں کو زیر کر کے آسمانوں پر چڑھو — ہاں بڑھو اے صف شکن ہیرو! بڑھو جلدی بڑھو

پاؤں میں تا چند زنجیرِ غلامی کی خراش — صرف اک جنبش! ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش

میری آوازوں سے کانپ اٹھتا ہے روحِ کاسکوں — جذبۂ غیرت کی آنکھوں میں اتر آتا ہے خوں

شور اٹھتا ہے محض اک وہم ہے دار و رسن — یا تو اب ہم تاج ہی پہنیں گے یا خونیں کفن

کپکپاتی ہے زمیں، اٹھتا ہے ہلکا سا غبار — دوڑنے لگتے ہیں مرکب، بڑھنے لگتے ہیں سوار

طبل کی دوں دوں سے جل اٹھتے ہیں آنکھوں میں چراغ — جھنجھناتے ہیں جلاجل سنسناتے ہیں دماغ

کھلنے لگتا ہے مگر جس وقت پرچم جنگ کا — پہلے بڑھ کر میں حکومت کو یہ دیتی ہوں صدا

اے جفا پرور امارت! دیکھ ناداروں سے بھاگ — بھاگ دیوانوں کی خوں آشام تلواروں سے بھاگ

موت کا پیغام ہے بپھرے ہوئے شیروں کا وار — مدعی! اکف در وہاں آبادیوں سے ہوشیار

خلق ہے بیتاب تیرا منہ جھلسنے کے لیے — تیرے سونے پر ہے اب لوہا برسنے کے لیے

تیرا مطبخ مفلسوں کی بھوک کھا جانے کو ہے — تیرے زر کی سرخیوں میں آگ لگ جانے کو ہے

حریت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون ؟ — جذبۂ خلق خدا کو فتح کر سکتا ہے کون ؟

اب بھی آنکھیں کھول لے جن خودی دیو ریا — جذبۂ خلق خدا ہے اصل میں عزمِ خدا

راہ سے اپنی مشیت کو ہٹا سکتا ہے کون؟
عزمِ خلاقِ جہاں کا سر جھکا سکتا ہے کون؟

گونجنے لگتی ہیں جب میری صدائیں مثلِ صور
سر اٹھا کر مسکراتا ہے حکومت کا غرور

مضحکہ اور قطرۂ شبنم کا انگاروں کے ساتھ
پنکھڑی اور ناز سے پیش آئے تلواروں کے ساتھ

عقل کا دستِ سبک رخشِ جنوں کی باگ پر
قہقہہ خس کا کڑکتی بجلیوں کی آگ پر

ایک مٹی کے دیے کا طنز اور کعبے کا طاق
نرم و نازک آبگینہ اور پتھر سے مذاق

اس تمسخر سے مرے سینے میں لگ جاتی ہے آگ
قلعۂ شاہی کی جانب موڑ دیتی ہوں میں باگ

پھر تو جاتا ہے جدھر میرا جنونِ تند خو
پشت پر ہوتی ہیں لاشیں، ہڈیاں، ڈھانچے، لہو

میرے گرد و پیش کی ہنگامہ خیزی الاماں
شور، غوغا، غلغلہ، فریاد، واویلا، فغاں

اللہ اللہ میرے دہشت ناک خونی ولولے
آندھیاں، طوفاں، تلاطم، سیل، صرصر، زلزلے

ابتری، وحشت، تزلزل، طنطنہ، دہشت، فساد
دبدبے، گرمی، کشاکش، دندنے، ہلچل، جہاد

کنگرے ایوانِ شاہی کے جھکا دیتی ہوں میں
جبر و استبداد کی چولیں ہلا دیتی ہوں میں

دندناتی گنبدِ زریں میں گھس جاتی ہوں میں
چاٹ کر سونے کا پانی آگ برساتی ہوں میں

میرے طوقِ بے گلہ کے سامنے بے اختیار
کانپتا ہے طرۂ طرفِ کلاہِ شہریار

باندھ کر پیماں گدا کی خفتہ سامانی کے ساتھ
کھیلنے لگتی ہوں ہولی خونِ سلطانی کے ساتھ

کس سے رکتی ہوں جب اپنی بات پر آتی ہوں میں
سلطنت کے سر کا گودا تک چبا جاتی ہوں میں

زیر دستوں کو دلا کر خونِ حاکم سے خراج
قیدیوں کے سر پہ رکھ دیتی ہوں آزادی کا تاج

شعلے کی مانند یوں لیتی ہوں پھر انگڑائیاں — سینۂ ارض و سما سے اٹھنے لگتا ہے دھواں

الاماں! میرا جنوں پرورتمرّد، الاماں! — آ، سنادوں میں تجھے دو حرف میں یہ داستاں

جب ازل میں سجدۂ آدم کا اٹھا تھا سوال — ہاں اسی ہلچل کے موقع پر کہ تھا وقتِ جلال

خود خدائے برتر و قہار سے افلاک پر — کی تھی میں نے گفتگو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

رعبِ سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں — جو خدائی سے لڑے، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟ — دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا — بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا

باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں — آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں

ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر — تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر — نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے — نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟

ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟ — سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟

لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں

دستِ کاریگر کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے؟

یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں؟
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی

پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے؟
"ڈائرِ" گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے

وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے

اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے؟
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے

اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا

آج کشتی امن کے امواج پر کھیتے ہو تم — سخت حیراں ہوں کہ اب کیوں درسِ حق دیتے ہو تم

اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں — "بینگی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم — ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم

اہلِ حق روشن نظر ہیں، اہلِ باطل کور ہیں — یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں

آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں — جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لیے کہتے نہیں

کیا کہا انصاف ہے انساں کا فرضِ اوّلیں — کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں — کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں

گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے — خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفاخانے میں ہے

آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے — کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟

سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے — نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے

ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے — لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے؟

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین — کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسینؑ

خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں — وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی — جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں — موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

کسان

جھٹپٹے کا نرم رَو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

دشت کے کام و دہن کو، دن کی تلخی سے فراغ
دور، دریا کے کنارے، دھندلے دھندلے سے چراغ

زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے ایک ہلکا سا دُود

وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا

خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان
بامِ گردوں پر کسی کے روٹھ کے جانے کی شان

دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور

پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستان
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں

ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ
نازپرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم
محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم

صبح کا فرزند، خورشیدِ زر افشاں کا علَم
محنت پیہم کا "پیماں"، سخت کوشی کی "قسم"

جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ
ماہ کا دل، مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ

قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام

خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اُڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب

قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خوں جھونکوں کا ہمدم تیز کرنوں کا رفیق

خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب

لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک
جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک

سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ

خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھپکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار — جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں — کھیت سے پھیرے ہوئے منہ، گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل! — سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل!

کون ہل! ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل — قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوشنما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ — خاندانِ تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام — شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا — مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں — کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں
پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک — مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی — خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی
جس کا مَس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر مہین — جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمیں

ہل پہ دہقان کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں — اور دہقان سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اُس سیاسی رتھ کے پہیوں پہ جاتی ہے نظر — جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے — دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ — فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار — گھر کی ناامید دیوی کا شبابِ سوگوار

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا

سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل، اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار

بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت! ساری کائنات؟

ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

دیکھ کر تیرے ستم، اے حامئ امن و اماں!
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں

اِدعائے پیرویٔ دین و ایماں، اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بیتاب ہیں

مہاجن اور مفلس

مہاجن

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی
سر پہ چٹیا، مردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی

دانت میلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغدار
ناک میں مونچھوں کے گو بجے، پیٹ میں توندی کا غار

سامنے غلے کے بورے، پشت پر الماریاں
بغبغوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں

کہنیاں تکیے کے اندر وزن سے دھنستی ہوئی
چست صدری، دائرے پر توند کے کھنچتی ہوئی

خوب لے لے کر ڈکاریں، دل کو بہلاتا ہوا
دونوں نتھنوں کو پھلائے، توند سہلاتا ہوا

ہنس کے غوطے، آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا
قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا

عذر کرتا، پے بہ پے تیوری چڑھاتا بار بار
شدّتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار

کشتیٔ ہستی کو جوئے سیم میں کھیتا ہوا
الٹی سانسیں، فربہی کے بار سے لیتا ہوا

رخ کی تاریکی پہ زر کی سرخیاں چھائی ہوئی
بے حقیقت خاک سونا بن کے اترائی ہوئی

کان کے بالے نمودِ زر کا دم بھرتے ہوئے
سود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے

عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہوا !
بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہوا

مفلس

ضعف سے آنکھوں کے نیچے تیلیاں پھرتی ہوئی
اوجِ خودداری سے دل پر بجلیاں گرتی ہوئی

لاش کاندھے پر خود اپنے جذبۂ تکریم کی
ملتجی چہرے پہ لہریں سی امید و بیم کی

عزتِ اجداد کے سر پر دمادم ٹھوکریں
رشتۂ آواز پر لفظوں کی پیہم ٹھوکریں

چہرۂ افسردہ پر ٹھنڈا پسینہ شرم کا
سست نبضیں، بھیک کا لہجے کے اندر ٹھیکرا

قرض کی درخواست کی الجھی ہوئی تقریریں
کپکپی اعصاب کی، بے چین دل کی لرزشیں

اک طرف حاجت کی شدت، اک طرف غیرت کا جوش
نطق پر حرفِ تمنا، دل میں غصے کا خروش

جنبشِ مژگاں کے زیرِ سایہ، ناداری کی رات
جوہرِ انسانیت جوڑے ہوئے آنکھوں میں ہات

سانس دہشت سے زمیں کی آسماں روکے ہوئے
مفلسی مردانہ لہجے کی عناں روکے ہوئے

لب کی خشکی، رخ پہ زردی، آنکھ شرمائی ہوئی
چشم و ابرو میں خودی کی آگ کجلائی ہوئی

نفس میں شیرانہ تیور، آرزو، روبہ مزاج
احتیاج و احتیاج و احتیاج و احتیاج

ترانۂ آزادیٔ وطن

(پہلی آواز)

بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

وطن کے ذرّے پاک پر ہے آب و رنگ سروری — قلندروں کے جام میں ہے بادۂ تونگری
سمندروں کی راگنی، ہمالیہ کی شاعری — ہجوم در ہجوم ہے، قطار در قطار ہے

بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

نشانِ صولتِ وطن مچل رہا ہے چرخ پر — دمک رہے ہیں بام و در جھلک رہے ہیں بحر و بر
چہک رہی ہے زندگی، چھلک رہا ہے جام زر — چلیں نہ رند کس لیے طرب میں سینہ تان کر
کہ آج طرفہ جیت کا گلے میں تازہ ہار ہے

بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

فلک پہ اوج کہکشاں، زمیں پہ موج گنگ ہے — تنِ عروس ہند پر عبائے شوخ و تنگ ہے
فسونِ عود و چنگ ہے، جنون آب و رنگ ہے — ترانہ ہے، ترنگ ہے، ابھار ہے، امنگ ہے
ہوائے شاخسار میں نوائے آبشار ہے

بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

سنا رہی ہے زندگی سرور کی کہانیاں رواں ہیں کامرانیاں، رواں ہیں شادمانیاں
برس رہی ہیں آسماں سے طرفہ دل ستانیاں ابل رہی ہیں خاک سے شگفتہ نوجوانیاں
روش روش نکھار ہے، چمن چمن پھوار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

۱ حیات اٹھی ہے جھومتی گلابیاں لیے ہوئے ادا و ناز و دلبری کا کارواں لیے ہوئے
جبیں پہ نرم کاکلوں کا بوستاں لیے ہوئے سیاہیوں کے سلسلے میں سرخیاں لیے ہوئے
فروغ روئے یار ہے کہ صبح کوہسار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

۲ حیاتِ نو کے زمزمے ہیں کوئے مے فروش میں حواس میں زمیں ہے نہ آسمان ہوش میں
ترنگ ہے شباب پر، امنگ ہے خروش میں چلے بھی جام زرفشاں کہ باغ ناو نوش میں
ہزار ہے، چنار ہے، ملہار ہے، ستار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

جنوں فروش مغ بچے! سرور کا پیام دے کنشت کے نگار دے، بہشت کے خیام دے
کہاں ہے پیر میکدہ؟ جوانیوں کے جام دے بتانِ سبزہ رنگ دے، شراب لالہ فام دے
کہ ناز ہے، نعیم ہے، نسیم ہے، نکھار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

چہک رہی ہیں بلبلیں، لچک رہی ہیں ڈالیاں　　تھرک رہی ہیں فرش گل پہ شوخ حُسن والیاں
نواگروں کی تال پہ بجا رہی ہیں تالیاں　　کھنک رہی ہیں چوڑیاں جھمک رہی ہیں بالیاں
ہر اک کمر کے لوچ میں کمان ہے کٹار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

(دوسری آواز)

یہ بیونت اور یہ کتر، یہ کاٹ چھانٹ، ابتری　　شناوروں کی ڈبکیاں بہادروں کی تھرتھری
یہ کوہکن کی بندگی، یہ بیرزن کی داوری　　قلندروں کے روپ میں یہ روسیاہ قیصری
شگفتہ برگ تازہ میں نہفتہ نوک خار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے
یہ مفلسوں کی گمرہی، یہ منعموں کی رہزنی　　فراز کے یہ قہقہے، نشیب کی یہ جانکنی
یہ بے دلی، یہ بے رخی، یہ برہمی، یہ بدظنی　　رمیدگی و شعلگی، کشیدگی و دشمنی
غبار حرب و ضرب ہے خروش گیر و دار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے
جنون و جبر و جنگ ہے، جہاد و جور و قہر ہے　　جدال گاؤں گاؤں ہے، قتال شہر شہر ہے
سیاہیوں کی موج ہے، تباہیوں کی لہر ہے　　ہوا میں جوئے مرگ ہے، فضا میں بوئے زہر ہے

کماں ہیں تیرِ شہنہ ہے، کمیں ہیں شہریار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

اِدھر مہا مہنت ہیں اُدھر کبیر امام ہیں
یہ تنگیوں میں پختہ ہیں، وہ وسعتوں میں خام ہیں
مہاجنوں کے جال ہیں، ریاستوں کے دام ہیں
"عوام" کا شمار کیا، عوام تو عوام ہیں
مویشیوں میں آج تک عوام کا شمار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

یہ لُٹّیں، یہ رشوتیں، یہ "پگڑیاں" یہ چوریاں
یہ شرمناک چوریاں اور اس پہ سینہ زوریاں
سُبک گراں فروشیاں، ذلیل نفع خوریاں
اِدھر خلا ہے پیٹ میں اُدھر بھری ہیں بوریاں
اُدھر گل و نسیم ہے، اِدھر سموم و خار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

(تیسری آواز)

میاں یہ وقت جشن ہے مباحثے سے فائدہ؟
محلِّ رقص و وجد ہے کہ راستہ تو پالیا
فضا سے ابر چھٹ گیا، ہوا کا رخ بدل گیا
جو دل میں ہے حسینیت تو کیا بلا ہے کربلا
وہ کل بنے گا بوستاں جو آج خارزار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

بھٹک کے جو بچھڑ گئے ہیں راستے پر آئیں گے
لپک کے ایک دوسرے کو پھر گلے لگائیں گے
ہم اگر حریف تھے، یہ بات بھول جائیں گے
ہنسیں گے مسکرائیں گے کھلیں گے گنگنائیں گے

یہ آرزوئے دہر ہے، یہ حکم روزگار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

اٹھو دریچہ کھل گیا، وہ منزلِ فراز کا
وہ غزنوی کے طاق میں دیا جلا ایاز کا
مرا ملا وہ عقدہ ہائے گیسوے دراز کا
چمن پہ رنگ چھا گیا، وہ چشم نیم باز کا

رقیب کم نصیب ہے، حبیب کامگار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

اٹھو سرِ نشیب کو غرورِ کوہسار دیں
سموم کو فسردگی، صبا کو نغمہ زار دیں
جُمود سنگ و خشت کو سرشت جوئبار دیں
غنودہ برگِ زرد کو مزاجِ ذوالفقار دیں

بڑھو کہ وہ کھلا ہوا درِ کُشودِ کار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

جو زندہ ہیں تو اس زمیں کو آسماں بنائیں گے
اجل کو قصرِ زندگی کا پاسباں بنائیں گے
خود آندھیوں کو طاقِ شمعِ زرفشاں بنائیں گے
بجائے شاخ برق پر خود آشیاں بنائیں گے

کہ دوشِ برق و باد پر بہشت لالہ زار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

ارے بتاؤ کون ہے یہ زندگی کا نغمہ خواں　　یہ کس کی زندہ گونج سے لرز رہا ہے آسماں
یہ کس کا حرف گرم ہے ستارہ بار و مہ چکاں　　ارے یہ کون بھر رہا ہے دلولوں میں بجلیاں
یہ شاعرِ حیات ہے، یہ جوشِ بادہ خوار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

ماتمِ آزادی

اے ہمنشیں! فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ　　رودادِ جام بخشیٔ پیرِ مغاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ　　کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ
کیا کیا نہ گل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے

شاخیں ہوئیں دو نیم جو ٹھنڈی ہوا چلی　　گم ہو گئی شمیم جو بادِ صبا چلی
انگریز نے وہ چال بہ جور و جفا چلی　　برپا ہوئی برات کے گھر میں چلا چلی
خونِ چمن بہار کے آتے ہی بہ گیا
اترا جو طوق اور بھی دم گھٹ کے رہ گیا

جھومی گھٹا، فضا سرور آمیز ہو گئی　　کھولی خوشی نے زلفِ غم انگیز ہو گئی

مچلی نسیمِ عقل، جنوں خیز ہو گئی　　سائے میں دھوپ اور بھی کچھ تیز ہو گئی

پارا، چلی جو سرد ہوائیں تو چڑھ گیا

درماں ہوا تو دردِ جگر اور بڑھ گیا

اک دل نشیں کلی جو سرِ باغ کھل گئی　　تو خاک میں لطافتِ گلزار مل گئی

پہنی قبائے نرم تو جلد اور چھل گئی　　ٹھہرا جو دل تو صبر کی بنیاد ہل گئی

شبنم اُدھر گہر، ورقِ گل پہ جڑ گئی

گلزارِ زندگی پر اِدھر اوس پڑ گئی

باجے بجے تو شورِ فغاں دور تک گیا　　کشتی ملی تو خیرے دریا بچک گیا

شبنم گری، دلِ سمن و سرد پک گیا　　بوندیں پڑیں تو اور بھی گلشن وندک گیا

اپنا گلا خروشِ ترنم سے پھٹ گیا

تلوار سے بچا تو رگِ گل سے کٹ گیا

دولت ملی تو اور بھی نادار ہو گئے　　صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہو گئے

اترا جو بار اور گراں بار ہو گئے　　آزادیوں ہوئے کہ گرفتار ہو گئے

پگھلا جو آسماں تو زمیں سنگ ہو گئی

پَو یوں پھٹی کہ صبحِ چمن دنگ ہو گئی

باطل ہوا جو خوف تو دل اور ڈر گیا — بھیگیں مسیں تو زیست کا منہ اور اتر گیا
پایا سبو تو عمر کا پیمانہ بھر گیا — پرساں ہوئے مسیح تو بیمار مر گیا

نغمے چھڑے تو شورشِ پیکار بن گئے
گونجے جو راگ تیغ کی جھنکار بن گئے

چہکے جو اعتماد کے گلزار میں طیور — بے اعتمادیوں کا گیا شور دُور دُور
دوڑا رخِ فسردہ پہ جب زندگی کا نور — دی موت نے صدا کہ "نمستے شری حضور"

باقی رہے جگہ نہ کوئی موت کے لیے
لونڈی سبھا میں آئی ہے ڈنڈوت کے لیے

فتنے مٹے تو امن کی دولت نہیں رہی — انسان کی وہ قدر وہ قیمت نہیں رہی
حاصل ہوا عروج تو عزت نہیں رہی — پائی جو حرّیت تو حرارت نہیں رہی

جب روزگار گرم ہوا سنگ ہو گئے
وسعت ملی تو اور بھی دل تنگ ہو گئے

چھٹکی جو چاندنی تو بڑھی ظلمتوں کی شان — بازار جب کھلا تو ہوئی بند ہر دکان
چھیڑے جو راگ سر پہ کڑکنے لگی کمان — چھت کی لگی جو ڈاٹ تو شق ہو گیا مکان

درماں سے اور دل ہمہ تن درد ہو گیا
پھوٹی کرن تو صبح کا منہ زرد ہو گیا

شادی ہوئی تو غم کے خزانے لٹا دیے　　کچھ یوں دیے جلائے کہ دل ہی بجھا دیے
سہرا بندھا تو شرم کے پردے اٹھا دیے　　مہندی لگی تو خون کے دریا بہا دیے

دولھا بنے تو حد مسرت سے بڑھ گئے
گھوڑے کے لات مار کے سولی پہ چڑھ گئے

دبکے تو سوزِ موج تکلم نہیں رہا　　چھکے تو لحن سازِ ترنم نہیں رہا
لپکے تو رقص و رنگ و تبسم نہیں رہا　　مہکے تو بوئے گل کا تلاطم نہیں رہا

کانپے جو تار دیو محن بولنے لگا
خیمے ہوئے جو نصب تو رن بولنے لگا

ابھرے تو جوش بادہ گساراں نہیں رہا　　بادل گھرے تو رنگ بہاراں نہیں رہا
بانہیں کھلیں تو رقص نگاراں نہیں رہا　　بوتل کھلی تو مجمع یاراں نہیں رہا

کوئی سبیلِ بادہ پرستی نہیں رہی
مستی کی رات آئی تو مستی نہیں رہی

جب باغبانِ قوم ظفر مند ہو گیا　　ہر برگِ نرم خاک کا پیوند ہو گیا
عاشق جو وصل یار سے خورسند ہو گیا　　فالج گرا دماغ پہ دل بند ہو گیا

اترا الجنار عقل کو طاعون ہو گیا
پیدا ہوا لہو تو جگر خون ہو گیا

بخیہ ہوا تو اور بھی چادر اُدھڑ گئی
بندھن کھلے تو جسم کی رگ رگ جکڑ گئی
بھرنے لگے جو شہر تو بستی اجڑ گئی
ٹوٹی رسن تو عقل میں زنجیر پڑ گئی

طاقت ملی تو کوئی توانا نہیں رہا
برسا جو مینہ تو کھیت کا دانا نہیں رہا

بارش ہوئی زمین دندک کر ابل گئی
اودی گھٹا اٹھی تو ہری دوب جل گئی
ابھری حیات، موت کے سانچے میں ڈھل گئی
باہیں پڑیں گلے میں کہ تلوار چل گئی

آبِ بقا سے زہر کی لہریں ابل پڑیں
بوسے لیے تو منہ سے زبانیں نکل پڑیں

دشمن گئے تو دوست بنے دشمنِ وطن
شبنم جو بی تو کھول گئے لالہ و سمن
سنکی ہوائے سرد تو کجلا گیا چمن
خلعت کی تہہ کھلی تو برآمد ہوا کفن

نغمے چھڑے تو شور سرِ بام مچ گیا
چٹکی کلی تو باغ میں کہرام مچ گیا

ہر موئے زلف اینٹھ گیا، مار بن گیا
ہر مہر کا خطیب جفاکار بن گیا
ہر صبح کا رسول، شبِ تار بن گیا
ہر لوچ اک اُبھی ہوئی تلوار بن گیا

بدلی نگاہ طور سے بے طور ہو گئے
ہم نوجوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے

سکھ نے گرو کے نام کو بٹّہ لگا دیا　　مندر کو برہمن کے چلن نے گرا دیا
مسجد کو شیخ جی کی کرامت نے ڈھا دیا　　مجنوں نے بڑھ کے پردۂ محمل جلا دیا

اک سوئے ظن کو غلغلۂ عام کر دیا
مریم کو خود مسیح نے بدنام کر دیا

سکوں کے انجمن میں خریدار آ گئے　　سیٹھوں کے خادمانِ وفادار آ گئے
کھدر پہن پہن کے بداطوار آ گئے　　در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے

تاریکیوں کو چھوڑ کے روشن جبیں گئے
جو لوگ آسمان تھے زیرِ زمیں[ل] گئے

پل بھر میں سو لے دشت جنوں مڑ گیا سماج　　اپنے وطن کی شرم نہ اپنے گرو کی لاج
رسمیں بدل گئیں، نہ وبالا ہوا رواج　　وہ گفتگو رہی نہ وہ لہجے، نہ وہ مزاج

گھر اپنا گھر گرہست ہی خود موسنے لگی
حدیے زبانِ دیو پری چوسنے لگی

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی　　چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمٰن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی　　گدّی سے کھنچ گئی جو زباں تھی عوام کی

حیوان بوکھلا گئے منہ کھونے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے

ل under ground :

نسرین و گل کو شعلۂ بے باک کر دیا　　سرو و چنار کو خس و خاشاک کر دیا
چھوڑے انار لاکھ کا گھر خاک کر دیا　　خود بوئے گل نے دامنِ گل چاک کر دیا

"شعلے بھڑک کے اٹھنے لگے دل کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

خائن ہوئے حریمِ امانت میں باریاب　　شیطاں بنے فرازِ ہدایت کے آفتاب
بیڑے ڈبو چکے ہیں جو بے حد و بے حساب　　ان ظالموں کا حضرتِ الیاس ہے خطاب

وہ جو تمام راہزنوں کا امام ہے
وہ شخص آج خضر علیہ السلام ہے

دیتے تھے صبح و شام سزائیں جو ناسزا　　گردن پہ جن کی خون ہے مردانِ راہ کا
کل جن کی ڈپٹیوں کا نشانہ تھے رہنما　　ان ڈپٹیوں کو ہم نے کلکٹر بنا دیا

قیدی چھٹے تو خیر سے برباد ہو گئے
جو قید کر رہے تھے وہ آزاد ہو گئے

حکام مجرموں کے ہیں دامن سیے ہوئے　　سی۔آئی۔ڈی ہے بادۂ غفلت پیے ہوئے
داروغہ جی ہیں قول، بدوں کو دیے ہوئے　　چوروں سے کوتوال ہے سازش کیے ہوئے

برٹش کے خادموں کو اچھالے ہوئے ہیں ہم
سانپوں کو آستین میں پالے ہوئے ہیں ہم

غدار تھے جو کل وہ محبِ وطن ہیں آج — بدخواہ باغ ہمدمِ سرو و سمن ہیں آج
کل تک تھے جو سموم انسیمِ چمن ہیں آج — خسرو کے جو غلام تھے وہ کوہکن ہیں آج
لچھمن کا دل ہے شدتِ غم سے پھٹا ہوا
در پر ہے رام چندر کے راون ڈٹا ہوا

مفسد ہیں فوج امن کے سالار آج کل — ڈاکو ہیں سیم و زر کے نگہ دار آج کل
زاغ و زغن ہیں مطربِ گلزار آج کل — افسر ہیں بلبلوں کے چڑیمار آج کل
چنگیز خاں ہیں عیسیِ دوراں بنے ہوئے
کانٹے ہیں چوب خیمۂ بستاں بنے ہوئے

برطانیہ کے خاص غلامانِ خانہ زاد — دیتے تھے لاٹھیوں سے جو حبِ وطن کی داد
جن کی ہر ایک ضرب ہے اب تک سروں کو یاد — وہ آئی۔سی۔ایس اب بھی ہیں خوش وقت و بامراد
شیطان ایک رات میں انسان بن گئے
جتنے نمک حرام تھے کپتان بن گئے

سینوں سے اٹھ رہی ہے وہی بے دلی کی بھاپ — اب بھی بغل میں تن کو دبائے ہوئے ہے پاپ
ماتھے پہ اب بھی "دولتِ طاغوت"[لے] کی ہے چھاپ — بیٹے ہیں اس کے آج بھی ہم لوگ اور وہ باپ
آزادیاں ہیں بوئے غلامی لیے ہوئے
اب بھی سروں پہ تاج ہے سایہ کیے ہوئے

لے: common wealth
دولتِ مشترک

جھونکوں میں رقص و کیف ہے موسم میں اعتدال
لہکا ہوا ہے باغ تو نکھرا ہوا ہلال
لیکن بہ ایں سرور بایں کثرتِ جمال
عشاق کی روش ہے نرالی شبِ وصال
معشوقہ ہے وفورِ حیا سے گڑی ہوئی
اغیار کے گلے میں ہیں باہیں پڑی ہوئی

اربابِ اقتدار کا اللہ رے کمال
دیکھو تو سر بلند، ٹٹولو تو پائمال
کالوں کے عارضوں پہ ہیں گوروں کے خد و خال
بھارت کا رنگ روپ ہے برٹش کی چال ڈھال
ہاتھوں میں پھول جیب میں ڈھیلے لیے ہوئے
ساری گرو کی شان ہیں چیلے لیے ہوئے

گو حکم ہے کہ بند شبستاں کا در نہ ہو
جو آئے اعتراض کسی شخص پر نہ ہو
قدغن ہے یہ مگر کہ لب خشک تر نہ ہو
اندر سبھا میں لال پری کا گزر نہ ہو
روشن تھے کل جو سرخ پیالوں کے سامنے
گل آج وہ چراغ ہیں کالوں کے سامنے

وحشت روا، عناد روا، دشمنی روا
ہل چل روا، خروش روا، سنسنی روا
رشوت روا، فساد روا، رہزنی روا
القصہ ہر وہ شے کہ ہے ناکردنی روا
انسان کے لہو کو پیو اذنِ عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے

جن کے قلم ہیں تیغ و تبر سے لڑے ہوئے　　جن کی لڑائیوں کے ہیں جھنڈے گڑے ہوئے
حق پر ہیں جو پہاڑ کی صورت اڑے ہوئے　　ذلت کے غار میں ہیں وہ اب بھی پڑے ہوئے

شاعر ہو یا ادیب قلندر ہے آج بھی
انگریز کا غلام گورنر ہے آج بھی

وہ شاعرانِ قوم گراں قدر و معتبر　　رہتے ہیں جن کی جیب میں اسرار بحر و بر
سورج پہ جن کا ہاتھ ہے اور پاؤں چاند پر　　روٹی وہ ڈھونڈتے ہوئے پھرتے ہیں دربدر

کیا چیز ہے ادب یہ کوئی جانتا نہیں
جانے وہ کیا جو حرف بھی پہچانتا نہیں

وہ جن کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں　　سب ہے سوا انہیں کے لیے تنگ ہے زمیں
دفتر میں کوئی قید، کوئی بوریا نشیں　　وہ ابتری ہے کوئی کہیں ہے کوئی کہیں

لوگ آئے اور گئے بھی غذا بانٹتے ہوئے
یہ رہ گئے دوات و قلم چاٹتے ہوئے

جاہل حضور کو نظر آتا ہے دوربیں　　عالم کو آنکھ اٹھا کے کبھی دیکھتے نہیں
باطل جبھی تو حق پہ چڑھائے ہے آستیں　　بیٹھی ہے آسماں کو دبوچے ہوئے زمیں

کوا ہے زمزموں کی ترازو بنا ہوا
مرغِ چمن ہے کاٹھ کا اُلو بنا ہوا

چھائی ہوئی ہیں زیرِ فلک بدحواسیاں　　آنکھیں اداس اداس تو منہ ہیں دھواں دھواں
منکے ڈھلے ہوئے ہیں تو اینٹھی ہوئی زباں　　وہ ضعف ہے کہ منہ سے نکلتی نہیں فغاں

اک دوسرے کی شکل کو پہچانتا نہیں
میں خود ہوں کون؟ یہ بھی کوئی جانتا نہیں

خاموش ہیں طیور، چمن سرمہ در گلو　　شاخیں فسردہ، خوشۂ انگور زرد رُو
پھولوں کو اب نہیں ہے تمنائے رنگ و بو　　بلبل کو آشیاں میں قفس کی ہے آرزو

غارت گرِ بہار کا منہ چومنے لگے
آئیں جو آندھیاں تو چمن جھومنے لگے

سَروِ سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار　　بلبل، نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جامِ جم، نہ جوانی نہ جوئے بار　　گلشن نہ گل بدن، نہ گلابی نہ گل عذار

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

پھر زلزلے ہیں راکبِ تمکینِ زندگی　　بے آئینی ہے ناظمِ آئینِ زندگی
پھر جرم بن چکے ہیں قوانینِ زندگی　　پھر موت ہے پیامبرِ دینِ زندگی

پھر تنگیٔ زندگی سے ڈرے جا رہے ہیں لوگ
بس اے حیات بس کہ مرے جا رہے ہیں لوگ

فٹ پاتھ، کار خانے، ملیں کھیت، بھٹیاں گرتے ہوئے درخت، سلگتے ہوئے مکاں
بجھتے ہوئے یقین، بھڑکتے ہوئے گماں ان سب سے اٹھ رہا ہے بغاوت کا پھر دھواں
شعلوں سے پیکروں کے لپٹنے کی دیر ہے
آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کی دیر ہے

وہ تازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار وہ سنسنائی آنچ وہ اڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ وہ غلطاں ہوا غبار اے بے خبر! وہ آگ لگی آگ، ہوشیار
بڑھتا ہوا فضا پہ قدم مارتا ہوا
بھونچال آ رہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

(۱۹۴۷ء)

جشنِ استقلال

١

نیرنگیٔ زمانہ سے مانا کہ آج کل — خود اپنے ہی لہو میں نہائے ہوئے ہیں ہم
دشمن بھی جس کو دیکھ کے دل میں اداس ہیں — اس طرح دوستوں کے ستائے ہوئے ہیں ہم
جس کو اس آسمان پہ رکھ دیں تو چیخ اٹھے — شانوں پہ وہ پہاڑ اٹھائے ہوئے ہیں ہم
یہ بھی عجب طلسم ہے اے دورِ زندگی — اپنوں کی انجمن میں پرائے ہوئے ہیں ہم
لیکن ان آفتوں کے تسلسل کے باوجود — دورِ طرب سے آس لگائے ہوئے ہیں ہم

٢

بھولا ہوا ہے ابلقِ ایام شوخیاں — پٹری کچھ ایسے ڈھب سے جمائے ہوئے ہیں ہم
جس سے گزر چکے ہیں قیامت کے کارواں — دھونی اسی گلی میں رمائے ہوئے ہیں ہم
جن کی ہر اک شکن میں بھنور تھے فساد کے — ان گیسوؤں کو پھر سے بنائے ہوئے ہیں ہم
جن نفرتوں نے خون کے دریا بہائے تھے — ان نفرتوں کا خون بہائے ہوئے ہیں ہم
ہر وہ کرن، فضا پہ جو برسا رہی تھی آگ — اس کو رگِ بہار بنائے ہوئے ہیں ہم
ہاتھوں میں سازِ وحدتِ انساں لیے ہوئے — نقشِ دوئی کو دل سے مٹائے ہوئے ہیں ہم
گلزار کا ہے خون کے دھارے سے راستہ — اس نکتۂ حیات کو پائے ہوئے ہیں ہم
پر ہول زلزلوں کی اکھڑنے لگی ہے سانس — کچھ یوں قدم زمیں پہ جمائے ہوئے ہیں ہم

۳

یہ جشنِ حریت ہے ـــــ بس اے یادِ رفتگاں   ہم کو نہ چھیڑ سوگ بڑھائے ہوئے ہیں ہم

یہ وقتِ رقص و رنگ ہے اے لیلیٰ حیات   ہاں تان اڑا کہ ساز ملائے ہوئے ہیں ہم

وہ رسمِ نامراد کہ تقویٰ کہیں جسے   اس رسم کا جنازہ اٹھائے ہوئے ہیں ہم

ہاں جام دے مغاں کہ تری بارگاہ میں   بادل کی طرح جھوم کے آئے ہوئے ہیں ہم

ہاں خیمہ زن ہو مہر و محبت کے بادلو   نفرت کی بجلیوں کے تپائے ہوئے ہیں ہم

ہاں جھول بے جھجک کہ تجھے لیلیٰ وطن   جھولے ہزار بار جھلائے ہوئے ہیں ہم

رندوں کے ساتھ ناچ کہ اے زندگی تجھے   ان اپنی انگلیوں پہ نچائے ہوئے ہیں ہم

کہتے ہیں جن کو شمس و قمر عرفِ عام میں   سو بار وہ پتنگ اڑائے ہوئے ہیں ہم

جس میں ہے ایک چاند سا مکھڑا چھپا ہوا   بچکی ہیں وہ نقاب اٹھائے ہوئے ہیں ہم

اے سرو ناز و شاخِ طرب، شوخ مغ بچے   لچکا کمر کہ وجد میں آئے ہوئے ہیں ہم

اے آسمان دیکھ کہ ان گردشوں پہ بھی   دھومیں تری زمیں پہ مچائے ہوئے ہیں ہم

آواز دے رہی ہے ہمیں کس لیے بہشت   ہندوستاں میں خیمہ لگائے ہوئے ہیں ہم

سمجھے ہوئے تھے ہم کو جو بے ہوش و بے خبر   ان سے کہو کہ ہوش میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہم پر ـــ جو کہہ رہے تھے ـــ کہ چھائی ہوئی ہے موت   وہ دیکھ لیں کہ موت پہ چھائے ہوئے ہیں ہم

آندھی اگر اٹھی ہے، اٹھے جوش لاکھ بار   سینوں میں شمعِ سرخ جلائے ہوئے ہیں ہم

رشوت

لوگ ہم سے روز کہتے ہیں یہ عادت چھوڑیے
یہ تجارت ہے خلافِ آدمیت چھوڑیے

اس سے بدتر لت نہیں ہے کوئی، یہ لت چھوڑیے
روز اخباروں میں چھپتا ہے کہ رشوت چھوڑیے

بھول کر بھی جو کوئی لیتا ہے رشوت چور ہے
آج قومی پاگلوں میں رات دن یہ شور ہے

کس کو سمجھائیں اسے کھو دیں تو پھر پائیں گے کیا
ہم اگر رشوت نہیں لیں گے تو پھر کھائیں گے کیا

قید بھی کر دیں تو ہم کو راہ پر لائیں گے کیا
"یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا"

ملک بھر کو قید کر دے کس کے بس کی بات ہے
خیر سے سب ہیں، کوئی دو چار دس کی بات ہے

یہ ہوس، یہ چور بازاری، یہ مہنگائی، یہ بھاؤ
رائی کی قیمت ہو جب پربت تو کیوں آئے نہ تاؤ

اپنی تنخواہوں کے نالے میں ہے پانی آدھ پاؤ
اور لاکھوں ٹن کی بھاری اپنے جیون کی ہے ناؤ

جب تلک رشوت نہ لیں ہم دال گل سکتی نہیں
ناؤ تنخواہوں کے پانی میں تو چل سکتی نہیں

رشوتوں کی زندگی ہے چور بازاری کے ساتھ   چل رہی ہے بے زری احکام زرداری کے ساتھ
پھرتیاں چوہوں کی ہیں بلی کی طراری کے ساتھ   آپ روکیں خواہ کتنی ہی ستم گاری کے ساتھ
ہم نہیں ہلنے کے، سن لیجے کسی بھونچال سے
کام یہ چلتا رہے گا آپ کے اقبال سے

یہ ہے مل والا، وہ بنیا ہے، یہ ساہوکار ہے   یہ ہے دوکاں دار، وہ ہے وید، یہ عطار ہے
وہ اگر ٹھگ ہے تو یہ ڈاکو ہے وہ بٹ مار ہے   آج ہر گردن میں کالی جیت کا اک ہار ہے
حیف ملک و قوم کی خدمت گزاری کے لیے
رہ گئے ہیں اک ہمیں ایمانداری کے لیے

بھوک کے قانون میں ایمانداری جرم ہے   اور بے ایمانیوں پر شرمساری جرم ہے
ڈاکوؤں کے دور میں پرہیزگاری جرم ہے   جب حکومت خام ہو تو پختہ کاری جرم ہے
لوگ اٹکاتے ہیں کیوں روڑے ہمارے کام میں
جس کو دیکھو خیر سے ننگا ہے وہ حمام میں

دیکھیے جس کو دبائے ہے بغل میں وہ چھرا   فرق کیا اس میں کہ مجرم سخت ہے یا بھربھرا
غم تو اس کا ہے زمانہ ہے کچھ ایسا کھردرا   ایک مجرم دوسرے مجرم کو کہتا ہے برا
ہم کو جو چاہیں سو کہہ لیں ہم تو رشوت خور ہیں
ناصحِ مشفق بھی تو اللہ رکھے چور ہیں

توند والوں کی تو ہو آئینہ داری واہ وا
اور ہم بھوکوں کے سر پر چاند ماری، واہ وا

ان کی خاطر صبح ہوتے ہی نہاری واہ وا
اور ہم چاٹا کریں ایمانداری واہ وا

سیٹھ جی تو خوب موٹر میں ہوا کھاتے پھریں
اور ہم سب جوتیاں گلیوں میں چٹخاتے پھریں

خوب حق کے آستاں پر اور جھکے اپنی جبیں
جا لیے رہنے بھی دیجے ناصحِ گہ دوں نشیں

توبہ توبہ ہم بھڑی میں آکے اور دیکھیں زمیں
آنکھ کے اندھے نہیں ہیں گانٹھ کے پورے نہیں

ہم بھٹک سکتے نہیں پرہیزگاری کے قریب
عقل مند آتے نہیں ایمانداری کے قریب

اس گرانی میں بھلا کیا غنچۂ ایماں کھلے
جو کے دانے سخت ہیں، تانبے کے سکے پل پلے

جائیں کپڑے کے لیے تو دام سن کر دل ہلے
جب گریباں تابہ دامن آئے تو کپڑا ملے

جان بھی دیدے تو سستے دام مل سکتا نہیں
آدمیت کا کفن ہے دوستو کپڑا نہیں

صرف اک پتلون سلوانا قیامت ہو گیا
وہ سلائی لی میاں درزی نے ننگا کر دیا

آپ کو معلوم بھی ہے، چل رہی ہے کیا ہوا؟
صرف اک ٹائی کی قیمت گھونٹ دیتی ہے گلا

ہلکی ٹوپی سر پہ رکھتے ہیں تو چکراتا ہے سر
اور جوتے کی طرف بڑھیے تو جھک جاتا ہے سر

تھی بزرگوں کی جو بنیائن وہ بنیا لے گیا   گھر میں جو گاڑھی کمائی تھی وہ گاڑھا لے گیا

جسم کی ایک ایک بوٹی گوشت والا لے گیا   تن میں باقی تھی جو چربی گھی کا بیپاری لے گیا

آئی تب رشوت کی چڑیا پنکھ اپنے کھول کر

ورنہ مر جاتے میاں کتے کی بولی بول کر!

پتھروں کو توڑتے ہیں آدمی کے استخواں   سنگ باری ہو تو بن جاتی ہے ہمت سائباں

پیٹ میں لیتی ہے لیکن بھوک جب انگڑائیاں   اور تو اور اپنے بچے کو چبا جاتی ہے ماں

کیا بتائیں بازیاں ہیں کس قدر ہارے ہوئے

رشوتیں پھر کیوں نہ لیں ہم بھوک کے مارے ہوئے

آپ ہیں فضلِ خدائے پاک سے کرسی نشیں   انتظامِ سلطنت ہے آپ کے زیرِ نگیں

آسماں ہے آپ کا خادم تو لونڈی ہے زمیں   آپ خود رشوت کے ذمہ دار ہیں فدوی نہیں

بخشتے ہیں آپ دریا، کشتیاں کھیتے ہیں ہم

آپ دیتے ہیں مواقع، رشوتیں لیتے ہیں ہم

ٹھیک تو کرتے نہیں بنیادِ ناہموار کو   دے رہے ہیں گالیاں گرتی ہوئی دیوار کو

سچ بتاؤں زیب یہ دیتا نہیں سرکار کو   پا لیے بیماریوں کو، مار دیے بیمار کو

علتِ رشوت کو اس دنیا سے رخصت کیجیے

ورنہ رشوت کی دھڑلے سے اجازت دیجیے

بد بہت بد شکل ہیں، لیکن بڑی ہے نازنیں — جڑ کو بوسے دے رہے ہیں، پیڑ سے چیں بر جبیں
آپ کو پانی اُلچتے ہیں بہ طرزِ دل نشیں — ناؤ کا سوراخ لیکن بند فرماتے نہیں
کوڑھیوں پر آستین کب سے چڑھائے ہیں حضور
کوڑھ کو لیکن کلیجے سے لگائے ہیں حضور

✓ دست کاری کے افق پر ابر بن کر چھائیے — جہل کے ٹھنڈے لہو کو علم سے گرمائیے
کارخانے کیجیے قائم، مشینیں لائیے — ان زمینوں کو جو محوِ خواب ہیں چونکائیے
خواہ کچھ بھی ہو منڈھے یہ بیل چڑھ سکتی نہیں
ملک میں جب تک کہ پیداوار بڑھ سکتی نہیں

✗ دل میں جتنا آئے لوٹیں قوم کو شاہ و وزیر — کھینچ لے خنجر کوئی، جوڑے کوئی چلے میں تیر
بے دھڑک پی کر غریبوں کا لہو اکڑیں امیر — دیوتا بن کر رہیں تو یہ غلامانِ حقیر
دوستوں کی گالیاں ہر آن سہنے دیجیے
خانہ زادوں کو یونہی شیطان رہنے دیجیے

✓ دام اک چھوٹے سے کوزے کے ہیں سو جامِ بلور — مول لینے جائیں اک قطرہ تو دیں نہر و قصور
اک دیا جو بیچتا ہے، مانگتا ہے شمعِ طور — اک ذرا سے سنگ ریزے کی ہے قیمت کوہِ نور
جب یہ عالم ہے تو ہم رشوت سے کیا توبہ کریں
توبہ رشوت کیسی، ہم چندہ نہ لیں تو کیا کریں

زلف اس کو آپریٹو سلسلے کی ہے دراز — چھیڑتے ہیں ہم کبھی تو وہ کبھی رشوت کا ساز
گاہ ہم بنتے ہیں قمری گاہ وہ بنتے ہیں باز — آپ کو معلوم کیا آپس کا یہ رازِ نیاز
ناؤ ہم اپنی کھواتے بھی ہیں اور کھیتے بھی ہیں
رشوتوں کے لینے والے رشوتیں دیتے بھی ہیں

بادشاہی تخت پر ہے آج ہر شے جلوہ گر — پھر رہے ہیں ٹھوکریں کھاتے زر و لعل و گہر
خاص چیزیں قیمتیں ان کی تو ہیں افلاک پر — آبخورہ منہ پھلاتا ہے اٹھنی دیکھ کر
بجو وہ آنے سیر کی آواز سن کر آج کل
لال ہو جاتا ہے غصے سے ٹماٹر آج کل

نسترن میں ناز باقی ہے نہ گل میں رنگ و بو — اب تو ہے صحنِ چمن میں خار و خس کی آبرو
خوردنی چیزوں کے چہروں سے ٹپکتا ہے لہو — روپیے کا رنگ فق ہے اشرفی ہے زرد رو
حال کے سکے کو ماضی کا جو سکہ دیکھ لے
سو روپیے کے نوٹ کے منہ پر دوانی تھوک دے

وقت سے پہلے ہی آئی ہے قیامت دیکھیے — منہ کو ڈھانپے رو رہی ہے آدمیت دیکھیے
دور جا کر کس لیے تصویرِ عبرت دیکھیے — اپنے قبلہ جوشؔ صاحب ہی کی حالت دیکھیے
اتنی گمبھیری پہ بھی مر مر کے جیتے ہیں جناب
سو جتن کرتے ہیں تو اک گھونٹ پیتے ہیں جناب

مستقبلِ ہندوستاں

کچھ ایسا آج گردوں کا سماں معلوم ہوتا ہے / کہ عکسِ آتشیں رطلِ گراں معلوم ہوتا ہے

یہ جنبش کس کے لالِ شکریں کو ہے کہ سناٹا / نشید شاعرِ جادو بیاں معلوم ہوتا ہے

یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر / زمیں کا ذرہ ذرہ پرفشاں معلوم ہوتا ہے

اٹھایا ہے یہ کس نے جھٹ پٹے کا طرفہ آئینہ / تبسّم کارواں در کارواں معلوم ہوتا ہے

یہ جوڑا کس نے باندھا ہے نشیلی انکھڑیاں مل کر / فضا میں داورِ پیرِ مغاں معلوم ہوتا ہے

یہ کس کے قشقۂ رنگیں کا پرتو ہے کہ ہر ذرہ / چراغِ محفلِ روحانیاں معلوم ہوتا ہے

جھپکتی ہیں یہ کس کی مدبھری آنکھیں ستاروں میں / جہاں مستِ شرابِ ارغواں معلوم ہوتا ہے

یہ کس کمسن نے باہیں ڈال دی ہیں گرم جوشی سے / جہاں باوصفِ پیری نوجواں معلوم ہوتا ہے

یہ کس کے روئے ناشستہ کا ہے رنگِ تنک تابی / افق پر اک سنہرا سا دھواں معلوم ہوتا ہے

لٹیں جنبش میں ہیں بادِ صبا یہ کس کے ماتھے پر / یقیں کی شمع پر دودِ گماں معلوم ہوتا ہے

یہ افشاں کس نے چھڑکی ہے طلسمی شبنمستاں میں / کہ ہر خوشہ جواہر کی دکاں معلوم ہوتا ہے

ترانے ہیں یہ کس دنیا کے مبہم آبشاروں کے / تخیّل موجۂ آبِ رواں معلوم ہوتا ہے

صبا یہ کس کی زلفِ خم بہ خم کو چھیڑ آئی ہے / زمانہ داستاں در داستاں معلوم ہوتا ہے

ہوا نے یہ اڑایا ہے سرا کس کی دُلائی کا
کہ عالم اک فسونِ کہکشاں معلوم ہوتا ہے

یہ زریں عرفۂ مشرق سے نکھرا کس کا دمکا ہے
دھندلکا موجِ ریگِ پرنیاں معلوم ہوتا ہے

یہ کس نے بربطِ زریں اٹھایا ہے کہ اک عالم
غزل خواں، گل چکاں، گوہر فشاں معلوم ہوتا ہے

خراماں یہ ہوا ہے کون شوخ و سنگ بستاں میں
چمن رقصاں رواں جنباں رواں معلوم ہوتا ہے

بحمد اللہ کہ جوشؔ اس صبحِ نو کی تازہ کاری میں
مجھے مستقبلِ ہندوستاں معلوم ہوتا ہے

ذاکر سے خطاب

ہوشیار اے ذاکرِ افسردہ فطرت ہوشیار
مردِ حق اندیشہ اور باطل سے ہو زار و نزار

ضعف کا احساس اور مومن کو کیا یہ خلفشار
لافتیٰ الا علیؑ لا سیف الا ذوالفقار

جو حسینی ہے کسی قوت سے ڈر سکتا نہیں
موت سے ٹکرا کے بھی ساونت مر سکتا نہیں

تو نہیں روحِ شہیدِ کربلا سے بہرہ مند
تیرے شانوں پر تو زلفِ بزدلی کی ہے کمند

سخت استعجاب ہے اے پیشہ ور ماتم پسند
بیروِ ضیغم کے سینے میں ہو قلبِ گوسفند

ننگ کا موجب ہے یہ اہلِ وغا کے واسطے
یوں نہ ماتم کر شہیدِ کربلا کے واسطے

مانعِ شیون نہیں میرا پیامِ مستقل
گریہ فطری شے ہے دشمن پر کبھی بھر آتا ہے دل
دل نہیں پتھر ہے مولا پر نہ ہو جو مضمحل
گریۂ مومن سے ہے تزئینِ بزمِ آب و گل

کون کہتا ہے کہ دل کے حق میں غم اچھا نہیں
پھر بھی شغلِ گریہ نصب العین بن سکتا نہیں

ہاں میں واقف ہوں کہ آنسو ہے وہ تیغِ آبدار
سنگ و آہن میں اتر جاتی ہے جس کی نرم دھار
ہے مگر مردانگی کو ان خنک اشکوں سے عار
جن کے شیشوں میں غلطاں ہوں شجاعت کے شرار

اشکِ بے سوزِ دروں پانی ہے ایماں کی قسم
قلبِ شبنم پر شعاعِ مہرِ تاباں کی قسم

سوچ تو اے ذاکرِ افسردہ طبع و نرم خو
آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤ ہو
فیس کا دریوزہ ہے منبر پہ تیری گفتگو

عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خونِ اہلبیت میں لقمے کو تر کرتا ہے تو

حرص نے تجھ کو سکھایا ہے دناءت کا سبق
کربلا کے ذکر میں لیتا نہیں کیوں نامِ حق
چشمۂ دولت ہے تیرا سیلِ اشکِ بے قلق
خون کی چادر سے سونے کے بناتا ہے ورق

خانۂ برباد ہے دولت سرا تیرے لیے
اک دفینہ ہے زمینِ کربلا تیرے لیے

کیا بتاؤں کیا تصور تو نے پیدا کر دیا — غیرتِ حق کو بھلا کر، حق کو رسوا کر دیا
کربلا و خونِ مولا کو تماشا کر دیا — "آب رُکنا باد" "وُ لبستانِ مصلےٰ" کر دیا

مشقِ گریہ عیش کی تمہید ہے تیرے لیے
عشرۂ ماہِ محرم عید ہے تیرے لیے

سوچ تو کچھ جی میں اے مشتاقِ راہِ مستقیم — مومنوں کے دل ہوں اور وا ماندۂ امید و بیم
شدتِ آہ و بکا سے دل ہوں سینوں میں دونیم — کیوں یہی اے وسے کے تھا کیا مقصدِ ذبحِ عظیم

خوف ہے قربانی اعظم نظر سے گر نہ جائے
ابنِ حیدر کے لہو پر دیکھ پانی پھر نہ جائے

سازِ عشرت ہے تجھے ذکرِ امامِ مشرقین — ڈھالتا ہے تیرے سکّے بستگانِ غم کا بین
تیری دارالضرب ہے اہلِ عزا کا شور و شین — سر جھکا لے شرم سے اے تاجرِ خونِ حسینؑ

ذہن میں آتا ہو جس کا نام تلواروں کے ساتھ
اُس کا ماتم اور ہو سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ

غم کے سکّے بہرِ زر تا کے بٹھائے جائیں گے؟ — کب تک ہم آخر پئے عشرت رلائے جائیں گے؟
دام پر تا چند یوں دانے گرائے جائیں گے؟ — آنسوؤں سے تا کجا "موتی" بنائے جائیں گے؟

بہرِ لقمہ تا بہ کے منبر پہ منہ کھولے گا تو؟
تا کجا پانی کے کانٹے پر لہو تولے گا تو؟

کربلا میں اور تجھ میں اتنا بعد المشرقین
اُس طرف شورِ رجز خوانی، ادھر دوسے کے بین
اُس طرف تکبیر، اِدھر ہنگامہائے شور و شین
اِس طرف اشکوں کا پانی، اُس طرف خونِ حسینؑ

وہ تھے کس منزل میں اور تو کونسی منزل میں ہے
شرم سے گڑ جا، اگر احساس تیرے دل میں ہے

کربلا سے واقفیت بھی ہے مردِ منفعل؟
کربلا در پردہ بشاش اور بظاہر مضمحل
جس کی رفعت سے بلندی آسمانوں کی خجل
جس کے ذرّوں پہ دھڑکتے ہیں جواں مردوں کے دل

خندہ زن ہے جس کی رفعت گنبدِ افلاک پر
مُہرِ تکمیلِ نبوت ثبت ہے جس خاک پر

جس کے ہر ذرے میں غلطاں ہیں ہزاروں آفتاب
خار کی نبضوں میں جاری ہے جہاں خونِ گلاب
جس کے خار و خس میں ہے خوشبوئے آلِ بوتراب
کربلا! تاریخِ عالم میں نہیں تیرا جواب

کربلا! تو آج بھی قائم ہے اپنی بات پر
مہراب بھی سجدہ کرتا ہے ترے ذرّات پر

اے چراغِ دودمانِ مصطفیٰؐ کی بارگاہ
تیرے خار و خس پہ ہے تابندہ خونِ بے گناہ
تیری جانب اٹھ رہی ہے اب بھی یزداں کی نگاہ
آ رہی ہے ذرے ذرے سے صدائے لا الٰہ

اے زمیں! خوش ہو کہ تیری زیب و زینت ہے حسینؑ
تیرے سناٹے میں محوِ خوابِ راحت ہے حسینؑ

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین — جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میّت پر نہ رویا وہ حسین — جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین

مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا
خون نے جس کے دو عالم میں اجالا کر دیا

نطق جس کا نغمۂ سازِ پیمبر وہ حسین — تھا جو شرحِ مصطفیٰ تفسیرِ حیدر، وہ حسین
تشنگی جس کی جوابِ موجِ کوثر وہ حسین — لاکھ پر بھاری رہے جس کے بہتّر وہ حسین

جو محافظ تھا خدا کے آخری پیغام کا
جس کی نبضوں میں مچلتا تھا لہو اسلام کا

ہنس کے جس نے پی لیا جامِ شہادت وہ حسین — مر گیا لیکن نہ کی فاسق کی بیعت وہ حسین
ہے رسالت کی سپر جس کی امامت وہ حسین — جس نے رکھ لی نوعِ انسانی کی عزّت وہ حسین

وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

اے حسین! اب تک گل افشاں ہے تری ہمت کا باغ — آندھیوں سے لڑ رہا ہے آج بھی تیرا چراغ
تو نے دھو ڈالے جبینِ ملتِ بیضا کے داغ — تیرے دل کے سامنے لرزاں ہے باطل کا دماغ

فخر کا دل میں دریچہ باز کرنا چاہیے
جس کا تو آقا ہو، اس کو ناز کرنا چاہیے

کھول آنکھیں اے اسیرِ کاکلِ زشت و نکو   آہ کن موہوم موجوں پہ بہا جاتا ہے تو
ختم ہے آنسو بہانے پر ہی تیری آرزو   اور شہیدِ کربلا نے تو بہایا تھا لہو

ہاتھ ہے ماتم میں تیرا سینۂ افکار پر
اور حسینؑ ابن علیؑ کا ہاتھ تھا تلوار پر

تھیں بہتّر خوں چکاں تیغیں حسینی فوج کی   اور صرف اک سید سجّاد کی زنجیر تھی
اتنی تیغوں کی رہی دل میں نہ تیرے یاد بھی   حافظے میں صرف اک زنجیر باقی رہ گئی

ذہن کو بے چارگی سے انس پیدا ہو گیا
اشجعِ عالم کے پیرو! یہ تجھے کیا ہو گیا

آہ تو اور سازو برگ عافیت کا اہتمام   کیوں نہیں کہتا کہ باطل کی حکومت ہے حرام
تجھ کو اور زنداں کا ڈر کیوں اے غلامِ ننگ و نام   جانتا ہے رہ چکے ہیں قید میں کتنے امام؟

تو مثالِ اہلبیت پاک مر سکتا نہیں
عشق کا دعویٰ ہے اور تقلید کر سکتا نہیں

دیکھ مجھ کو دیکھ، میں ہوں ایک رندِ بادہ خوار   رسم تقویٰ ہی سے واقف ہوں نہ طاعت سے دوچار
سر پہ ہے شملہ نہ کاندھے پر عبائے زرنگار   موت کو لیکن سمجھتا ہوں حیاتِ پائیدار

رسم و راہِ زہد و تقویٰ کو سبک کرتا ہے تو
قتل سے ڈرتا نہیں میں، قید سے ڈرتا ہے تو

خوف کا جن ہے زمانے سے ترے سر پر سوار   خوف ہے اک نامبارک طائرِ مردار خوار

باغ و بُستاں سے نہیں ہوتی نظر جس کی دوچار   روز و شب لاشوں پہ منڈلاتا ہے جو دیوانہ وار

تیرے سر پر اس کا منڈلانا تماشا تو نہیں ؟

غور کر تو اک عفونت خیز لاشا تو نہیں ؟

خلق میں محشر بپا ہے اور تو مصروفِ خواب   خون میں ذلت کی موجیں کھا رہی ہیں پیچ و تاب

تیری غیرت کو خبر بھی ہے کہ دشمن کا عتاب   تیری ماں بہنوں کی راہوں میں الٹتا ہے نقاب

اب تو زخمی شیر کی صورت بپھرنا چاہیئے

یہ اگر ہمت نہیں تو ڈوب مرنا چاہیئے

دیکھ تو کتنی مکدر ہے فضائے روزگار   کس طرح چھایا ہوا ہے، حق پہ باطل کا غبار

بزمِ یزدانی میں روحِ اہرمن ہے گرمِ کار   میان سے باہر ابل پڑ، اے علیؑ کی ذوالفقار

نقشِ حق کو اب بھی او غافل! جلی کرتا نہیں

اب بھی تقلیدِ حسین ابن علی کرتا نہیں!

شبنم

پروگرام

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈھنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا

اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا

اور ہو گا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح خانۂ ویراں میں ملے گا

خرابات

یہ خرابات ہے تقوے کا نہیں کام یہاں
عینِ طاعت ہے تماشائے لبِ بام یہاں

رقص کرتی ہے زمیں رات کی رنگینی میں
وجد کرتا ہے فلک صبح کے ہنگام یہاں

میکدے میں نہ ہوا اے شیخِ حرم نکتہ فروش
کہ ازل سے نہیں گنجائشِ اوہام یہاں

اثرِ تربیتِ پیرِ مغاں کے قربان
خارج از بحث ہے اندیشۂ آلام یہاں

شکر باری کے علی الرغمِ فقیہہ خود بیں
حکمِ ایزد ہے کہ گردش میں رہے جام یہاں

میکدے کا ہے مشیت کے اشاروں پہ مدار
جام در دست ہیں خود شرع کے احکام یہاں

طوطیٔ قدس ہے اک رشتہ بپا صیدِ زبوں
طائرِ سدرہ ہے اک مرغِ تہِ دام یہاں

سایۂ زلف سے ہے زینتِ دوشِ رنداں
ظلمتِ کفر سے ہے رونقِ اسلام یہاں

اثرِ بے بصری ہے طلبِ جاہ و نمود
ہدفِ مسخرگی ہے ہوسِ نام یہاں

خونِ رندانِ قدح خوار ہے اور لعلِ نگار
لبِ جبریل نہیں در خورِ پیغام یہاں

کسی صورت میں بھی باقی نہیں جائے تاویل
کسی آیت میں بھی ممکن نہیں ابہام یہاں

شعلۂ عشق ہے اس راہ میں چڑھتی ہوئی دھوپ
مشعلِ عقل ہے خورشیدِ لبِ بام یہاں

منزلیں راہ میں تبدیل ہوا کرتی ہیں
رو بہ آغاز ہی رہتا ہے ہر انجام یہاں

(۸۹)

قیمتِ بادہ میں جو خرقہ کہ ہوتا ہے گرد — اس پہ قربان ہیں سو جامۂ احرام یہاں
خوفِ عقبیٰ کی اداسی کے عوض چہروں پر — کھیلتا ہے اثرِ بادۂ گلفام یہاں
اک توہم ہے رہ و رسمِ شمارِ مہ و سال — اک تمسخر ہے نظامِ سحر و شام یہاں
ذرّے ذرّے پہ ہے اتنا ابدیّت کا جلال — وقت رہتا ہے سدا لرزہ براندام یہاں
گردِ رندانِ سیہ مست، بصد عشوہ و ناز — حلقہ باندھے ہوئے رہتے ہیں گل اندام یہاں
خوابِ صد سالہ کے مانند ہے اے محرمِ راز — وقفۂ یک نفس و لغزشِ یک گام یہاں
لب ہلاتے ہی جو دنیا کو ہلا دیتے ہیں — چند ایسے بھی نکل آئیں گے خدّام یہاں
شکر ہے جوشؔ کہ اوراد و وظائف کے عوض — لب پہ ہے زمزمۂ حافظ و خیام یہاں

بھٹکی ہوئی نیکی

ہر شے کو مسلسل جنبش ہے، راحت کا جہاں میں نام نہیں
اس عالمِ سعی و کاوش میں انساں کے لیے آرام نہیں

چھائی ہے فضا پر تشنہ لبی، مفقود یہاں سیرابی ہے
ہر جسم میں اک بے چینی ہے، ہر روح میں اک بے تابی ہے

اس بزمِ خلش کا ہر ذرّہ، بے چینیوں کے انبوہ میں ہے
اک رعشۂ مبہم کاہ میں ہے، اک لرزشِ پنہاں کوہ میں ہے

لیلائے سماعت مضطر ہے، عشرت کے ترانے سننے کو
ہر نقص کا دامن پھیلا ہے تکمیل کی کلیاں چننے کو

ہیجان ہے چشمِ پستی میں رفعت کا نوشتہ پڑھنے کا
اک دھن ہے ترقی کرنے کی اک جوش ہے آگے بڑھنے کا

ہر موم کی دھن ہے شمع بنے مضطر ہے پگھل جانے کے لیے
ہر سنگ کا سینہ جلتا ہے پارس میں بدل جانے کے لیے

انگاروں پہ شعلے لوٹتے ہیں بجلی پہ تفوق پانے کو
چنگاریاں مرغِ بسمل ہیں تاروں کی جگہ کھل جانے کو

بے چین بگولا رقصاں ہے آندھی پہ شرف پانے کے لیے
جو موج ہے پیچ و تاب میں ہے دھارے سے الجھ جانے کے لیے

ہر قطرۂ دریا غلطاں ہے، موتی پہ تسلط پانے کو
ہر ذرّۂ خاکی اڑتا ہے خورشید سے ٹکر کھانے کو

ہر دل میں غرض اک کاہش ہے امید کا ساغر بھرنے کی
ہر شے کی تڑپتی فطرت میں خواہش ہے ترقی کرنے کی

ہر لمحہ یہ خواہش روحانی جذبوں کو ابھارا کرتی ہے
میدان کے تپتے ذرّوں کو سورج سے پکایا کرتی ہے

وہ چور جو شب کے پردے میں سرقے کی غرض سے آتا ہے
جو نیند کی ماتی بستی پر ظلمت کی طرح چھا جاتا ہے

اک ایسی ہی خواہش اس کو بھی چوری کے لیے اکساتی ہے
جس طرح کی خواہش نورانی دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے

سارق بھی فرشتوں ہی کی طرح تسکین و طرب کا جویا ہے
ہر چند کہ اس نے قسمت سے تسکین کا رستہ کھویا ہے

رہبر ہو کہ رہزن دونوں میں تسکین کی خواہش یکساں ہے
ہر چند وہ سیدھی راہ پہ ہے، یہ راہ بھٹک کر حیراں ہے

عارف نے یہ سمجھا آسائش اشکوں کو گرا کر ملتی ہے
قاتل نے یہ سمجھا انساں کا وہ خون بہا کر ملتی ہے

صوفی نے یہ سمجھا وہ دل کے پیمانے میں مل جائے گی
میکش کی سمجھ میں یہ آیا میخانے میں مل جائے گی

پس ذوق طرب میں جو انساں بہتا ہے سدا میخانوں میں
ہے اصل میں وہ بھی دنیا کے معصوم ترین انسانوں میں

جال اس پہ نہ ڈال اے صید افگن یہ بام حرم کا طائر ہے
آیا ہے بھٹک کر دیر میں جو گمراہ نہیں ہے، زائر ہے

جتنے بھی زمیں پر مجرم ہیں خواہش ہی کے زیر فرماں ہیں
ہر جرم سیہ کے محضر پر خواہش ہی کی مہریں تاباں ہیں

المختصر ان تشریحوں سے ہم پر یہ حقیقت کھلتی ہے
کہتے ہیں جسے دنیا میں "بدی" بھٹکی ہوئی وہ اک "نیکی" ہے

ابدی شعلہ

زباں ساکت ہے لیکن تر زبانی اب بھی ہوتی ہے
لبِ خاموش سے جادو بیانی اب بھی ہوتی ہے

حدیثِ نفس کی صورت میں اکثر خود بخود پہروں
زمانِ کیف کی افسانہ خوانی اب بھی ہوتی ہے

لبِ گل رنگ کو ہوتی ہے جنبش جب تصور میں
سماعت کی زمیں پر گل فشانی اب بھی ہوتی ہے

کبھی جب عہدِ رنگینی کی راتیں یاد آتی ہیں
عروسِ شوق کی پوشاک دھانی اب بھی ہوتی ہے

بہ ایں طغیانِ حکمت، کون مانے گا کہ اس دل پر
مسلط ہر بلائے آسمانی اب بھی ہوتی ہے

رسولِ شادمانی ہوں مگر چھڑتے ہیں جب نغمے
نظر سے سوزِ غم کی ترجمانی اب بھی ہوتی ہے

خدائے خندہ ہوں، لیکن جب ان کی یاد آتی ہے
مری آنکھوں سے اشکوں کی روانی اب بھی ہوتی ہے

ترانوں سے مری محفل کو گو فرصت نہیں ملتی
مگر تنہائیوں میں نوحہ خوانی اب بھی ہوتی ہے

بہ ایں مشقِ تحمل، بارہا خاموش راتوں میں
کسی کی یادِ مرگِ ناگہانی اب بھی ہوتی ہے

خرد کا دور ہے لیکن مرے کمبخت سینے میں
جنوں کی گاہے گاہے پر فشانی اب بھی ہوتی ہے

کسی کے روئے رنگیں کی صباحت کے تصور میں
چمن کی چاندنی اکثر سہانی اب بھی ہوتی ہے

دفورِ یاس سے گو دل رہینِ برف و شبنم ہے
کبھی پچھلے پہر آتش فشانی اب بھی ہوتی ہے

نہ جانے جوش کس ارماں میں اب تک جان باقی ہے
کہ اکثر آرزوئے زندگانی اب بھی ہوتی ہے

گنگا کے گھاٹ پر

بڑھائے سرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے — نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے
بسرا ڈلائی کا سر پر نظر جھکائے ہوئے — دبائے دانتوں میں آنچل، بدن چرائے ہوئے
لبوں پہ مہر خموشی، خموشیوں میں خطاب — کمر میں لوچ، جبیں پر دمک، نظر میں شراب
قدم قدم پہ تمنائیں دلستانی کی — رخِ شگفتہ پہ طغیانیاں جوانی کی
شراب ناب لیے نرگسی کٹوروں میں — لہو چمن کا رواں سرخ سرخ ڈوروں میں
دراز زلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں مدھ — نسیم صبح بنارس، ہلالِ شام اودھ
ہوائے صبح سے روشن چراغِ سیم تنی — شگفتہ غسلِ سحر سے مزاجِ گل بدنی
نظر نہ آئے وہ چہرے پہ چادرِ آبی — بیاضِ چشم میں گل کاریٔ شکر خوابی
خنک نسیم سے ابھرے ہوئے نقوش شباب — صباحتیں ہیں کہ برسات کی شبِ مہتاب
عجیب حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے — مہک رہا ہے بدن کمسنی کی خوشبو سے
مقابلہ جو کرے کوئی چاند پھیکا ہے — جبینِ شوخ پہ صندل کا سرخ ٹیکا ہے
نمی ہے زلف میں، اشنان کر کے نکلی ہے — یہ کس کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے
لبوں پہ کھیل رہا ہے اثر نہانے کا — گمان ہوتا ہے ہر بار مسکرانے کا

سیاہ زلف پہ آنچل خفیف آبی ہے
برہنہ پا ہے تو ہر نقش پا گلابی ہے
مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرمِ خطاب
کہ وقت صبح ہے اے دخترِ شبِ مہتاب
ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں
ادھر بھی ایک نظر، میں ترا پجاری ہوں

جادو کی سرزمین

غروب، سلسلۂ کوہسار، ویرانہ
سنا رہی ہے خموشی کو ریل افسانہ
ادھر پہاڑ، ادھر کھیتیوں کی پگڈنڈی
ہوائے شام کہیں گرم اور کہیں ٹھنڈی
اِدھر اُدھر کچھ اندھیرے میں مرد و زن ہیں رواں
کہانیوں کے وہ جن ہیں یہ خواب کی پریاں
سیاہیوں میں چمکتی ہوئی جبینیں سی
نظر کے سامنے جادو کی سرزمینیں سی
رخِ افق پہ سیہ دھاریوں کی باریکی
پہاڑیوں پہ گھٹا، جھاڑیوں پہ تاریکی
شکستہ حال گدھوں کا ہجوم گھوروں پر
سیہ مشین کا بھورا دھواں کھجوروں پر
ندی اداس، ہوا دردناک، بن خاموش
زمیں فسوں بہ بغل، آسماں فسانہ بدوش
دور رویہ تار کے کھمبوں پہ ایک پرتوِ راز
ندی کے موڑ پہ صحرا نشیں دیے کا گداز
دیے کی لو جو ہواؤں سے جھلملاتی ہے
فروغِ عمرِ گذشتہ کی یاد آتی ہے

رقص

ہاں اٹھا لے روحِ موسیقی ربابِ زرفشاں
رقص کی تشریح پر مائل ہے شاعر کی زباں

رقص کیا ہے؟ خاک کے دل میں خروشِ کائنات
پیکرِ فانی میں گرمِ ناز، لافانی حیات

جلوۂ محدود کے دل میں بہ ایمائے شباب
حسنِ لامحدود بن جانے کا شیریں پیچ وتاب

چاندنی میں جوئے شیریں جیسے تھم تھم کر بہے
انکھڑیوں کی شعرگوئی، ساعدوں کے زمزمے

محفلِ صورت میں پھیلائے معانی کا بناؤ
چشمکِ بیباک میں سیال نغموں کا بہاؤ

خون میں لہریں پہ لہریں لحنِ بے آواز کی
لغزشوں پر لغزشیں مشقِ خرامِ ناز کی

خیر سمجھا دوں، ذرا لانا تو مینائے شراب
رقص اس موقع پہ چہرہ سے الٹتا ہے نقاب

جب صبا کی سنسناہٹ اور ساغر کی کھنک
قامتِ موزوں پہ بن جاتی ہے ہلکی سی لچک!

رقص ہے دراصل برنائی کا لحنِ بے خروش
قلبِ نازک میں تمنائے ہم آغوشی کا جوش

جنبشِ مژگاں کی رنگیں مست، شیریں داستاں
عشوۂ ترکانہ کی سحر آفریں انگڑائیاں

معنیٔ بے لفظ کی شرحِ دل آویز و خموش
جراتِ پنہاں کی بیتابی، تمنا کا خروش

خون کی گردش میں رہ رہ کر بہ رنگِ زیر و بم
حوصلوں کی بے قراری، ولولوں کا پیچ و خم

جوئے طوفاں خیز کے سانچے میں ڈھلنے کی امنگ
بھنچ کے آغوشِ تمنا میں مچلنے کی امنگ

دست و پا کے لوچ میں اس حرفِ مبہم کا ظہور
نطق کی پرواز سے ہے آشیا جس کا دور

خال و خد کی نغمہ ریزی، ابروؤں کی گفتگو
نرگسِ مخمور میں طغیانِ شرحِ آرزو

جذبۂ بیدار کا پالا ہوا خوابِ گراں
جنبشِ مژگاں کی گویائی اشاروں کی زباں

ایک ایسا ساز، ما بین یقین و اشتباہ
پا سکے جس کو نہ کان اور سن سکے جس کو نگاہ

جوش! بس خاموش ہو پیمانہ بھرنے دے مجھے
جھوم کر بربط اٹھا اور رقص کرنے دے مجھے

سرشکِ تبسّم

اٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ بربط ہے، یہ مے، آگے خدا کا نام ہے ساقی

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی، فقط اک نام ہے ساقی

سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی

ادھر یہ قول، ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
ادھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

ادھر تکمیلِ دیں کا ہو چکا ہے دعویٰ محکم
ادھر ایماں تھا جیسا خام اب تک خام ہے ساقی

ادھر شدت کے ساتھ اعلان ہے "اتمامِ نعمت" کا — ادھر ہر سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے — سزا کیا ہوگی اس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی — خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رشتہ ہے جب دستِ ماحول و وراثت میں — تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی — یہ کس آغاز کی سعیٔ زبوں انجام ہے ساقی

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی — یہاں موجِ ہوا تک مرغِ زیرِ دام ہے ساقی

تبسم اک بڑی دولت ہے جس کا میں بھی قائل ہوں — مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں — وہ آبِ صاف بھی افسردۂ اصنام ہے ساقی

خروشِ گریہ ہی حامل نہیں غمہائے پنہاں کا — یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کہرام ہے ساقی

لڑکپن ضد میں روتا تھا، جوانی دل کو روتی ہے — نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی

تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سلاتی ہے — نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی

بڑی دریا دلی کے ساتھ ہر خوں ریز طاقت کو — مشیت کی طرف سے اذنِ قتلِ عام ہے ساقی

یہ کس کی مہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر — کہ ہر ذرّہ ازل سے لرزہ بر اندام ہے ساقی

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں — کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

خاتونِ مشرق

غنچۂ دل مرد کا روزِ ازل جب کھِل چکا
جس قدر تقدیر میں لکھا ہوا تھا مل چکا

دفعتہً گونجی صدا پھر عالمِ انوار میں
"عورتیں دنیا کی حاضر ہوں مرے دربار میں"

عورتوں کا کارواں پر کارواں آنے لگا
پھر فضا میں پرچمِ انعام لہرانے لگا

ناز سے حوریں ترانے حمد کے گانے لگیں
عورتیں بھر بھر کے اپنی جھولیاں جانے لگیں

جب رہا کچھ بھی نہ باقی کیسۂ انعام میں
کانپتی حاضر ہوئیں پھر ایشیا کی عورتیں

دل میں خوفِ شومیٔ قسمت سے گھبرائی ہوئی
رعب سے نیچی نگاہیں، آنکھ شرمائی ہوئی

حلم کے سانچے میں روحِ ناز کو ڈھالے ہوئے
گردنوں میں خم، سروں پر چادریں ڈالے ہوئے

آخر اس انداز پہ رحمت کو پیار آ ہی گیا
میکدے پہ جھوم کر ابرِ بہار آ ہی گیا

مسکرا کر خالقِ ارض و سما نے دی ندا
اے غزالِ مشرقی! آ تخت کے نزدیک آ!

نعمتیں سب بٹ چکیں لیکن نہ ہو نا مضمحل
سب کو بخشتے ہیں دماغ اور لے تجھے دیتے ہیں دل

یہ وہی دل ہے جو مضطر ہو کے سوز و ساز سے
میرے پہلو میں دھڑکتا تھا عجب انداز سے

تجھ کو وہ رخ اپنی سیرت کا دیے دیتے ہیں ہم
جس میں یزدانی نسائیت کے زلفوں کے ہیں خم

آ، کہ تجھ کو صاحبِ مہر و وفا کرتے ہیں ہم
لے خود اپنی جنبشِ مژگاں عطا کرتے ہیں ہم

پہلوئے خاتونِ مشرق میں بصد تمکین و ناز
منتقل ہو جائے تو ہیئت کے سینے کے گداز

عورتیں اقوامِ عالم کی بھٹک جائیں گی جب
تو رہے گی بن کے اس طوفاں میں اک موجِ طرب

حُسن ہو جائے گا جب اوروں کا وقفِ خاص و عام
دیدنی ہو گا ترے خلوت کدے کا اہتمام

عالمِ نسواں پہ کالی رات جب چھا جائے گی
یہ ترے ماتھے کی بِندی صبح کو شرمائے گی

عورتیں بیچیں گی جب اسٹیج پر بارقص و چنگ
اپنی آنکھوں کی لگاوٹ، اپنے رخساروں کا رنگ

ان کے آگے ہر نیا میدان ہو گا جلوہ گاہ
اور ترا اسٹیج ہو گا صرف شوہر کی نگاہ

گودیاں پھیلا کے جب مانگیں گی با صدق و صفا
عورتیں اولاد کے پیدا نہ ہونے کی دعا

مژدہ باد اے ایشیا کی دخترِ پاکیزہ تر!
آنچ آئے گی نہ تیرے مادرانہ ذوق پر

ماؤں کی غفلت سے بچوں کو نہ پہنچے گا گزند
جب فغاں بے تربیت اولاد کی ہو گی بلند

صرف اک تیرا تبسم اے جمالِ تابناک
سینۂ اطفال میں پیدا کرے گا روحِ پاک

وہ حرارت تیرے ہونٹوں کی نہ ہو گی پائمال
جس کے شعلوں سے نکھر جاتا ہے رنگِ نونہال

وہ تری معصوم رعنائی نہ ہو گی مضمحل
بخشتی ہے نسلِ انسانی کے پہلو کو جو دل

وہ بھی دن آئے گا جب تجھ کو ہی اے مستِ حجاب
زیب دے گا مادرِ اولادِ آدم کا خطاب

جب کرے گی صنفِ نازک اپنی عریانی پہ ناز
صرف اک تو اس تلاطم میں رہے گی پاکباز

ان کے دل جب ہوں گے یادِ معصیت سے پاش پاش
تیرے رخ پر ایک بھی ہو گی نہ ماضی کی خراش

ان کی راتیں خوفِ رسوائی سے ہوں گی جب دراز
تیرے سینے میں کسی شب کا نہ ہو گا کوئی راز

دہشتِ فردا سے جب تھرائے گا ان کا غرور
حال سے تو ہو گی راضی، خوفِ مستقبل سے دور

جب اُڑے گی ان کی چشمِ دام پروردہ میں خاک
نرم ڈورے تیری آنکھوں میں رہیں گے تابناک

نرم ہوں گے تیرے جلوے بھی، تری گفتار بھی
باحیا ہو گی تری پازیب کی جھنکار بھی

چھاؤں بھی ہو گی نہ تیری بزمِ ناؤنوش میں
تیرا پرتو تک رہے گا شرم کے آغوش میں

اے شعاعِ ارضِ مشرق تیری عفت کا شعار
کج کرے گا ملک و ملّت کی کلاہِ افتخار

آبرو ہو گا گھرانے بھر کی تیرا رکھ رکھاؤ
دے گا تیرا باپ شانِ فخر سے موچھوں پہ تاؤ

تیری آنکھوں کی کرن سے اے جہانِ اعتبار
جگمگائے گی نسب ناموں کی لوحِ زرنگار

بوالہوس کا سر جھکا دے گی تری ادنیٰ جھلک
ہو گی لہجے میں ترے نبضِ طہارت کی دھمک

تیری پیشانی پہ جھلکے گا مثالِ برقِ طور
طفل کا نازِ شرافت اور شوہر کا غرور

علم سے ہر چند تجھ کو کم کیا ہے بہرہ مند
لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت دردمند

جب ضرورت سے زیادہ ناز فرماتا ہے علم
عارضِ تاباں کے بھولے پن کو کھا جاتا ہے علم

نطق ہو جاتا ہے علمی اصطلاحوں سے اداس
لعلِ لب میں شہد کی باقی نہیں رہتی مٹھاس

علم اٹھا لیتا ہے بزمِ جاں سے شمعِ اعتقاد
خال و خد کی موت ہے چہرے کی شانِ اجتہاد

قعرِ وحشت کی طرف مڑتی ہے اکثر راہِ فن
جھانکتی رہتی ہے اس غرفے سے چشمِ اہرمن

چھوڑ دیتی ہے تکلم کو ملائم قیل و قال
علم کا حد سے گزر جانا ہے توہینِ جمال

علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل ہے وہ بد دماغ
جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ

علم سے باقی نہیں رہتے محبت کے صفات
اور "محبت" ہے فقط لے دے کے تیری کائنات

دیکھ تجھ پر علم کی بھرپور پڑ جائے نہ ضرب
بھاگ، اس پردے میں ہیں شیطان کے آلاتِ حرب

علم سے رہتی ہے پابندِ شکن جس کی جبیں
ناز سے شانوں پر اس کی زلف لہراتی نہیں

وقت سے پہلے بلا لیتے ہیں پیری کو علوم
عمر سے آگے نکل جاتے ہیں چہرے بالعموم

جن لبوں کو چاٹ پڑ جاتی ہے قیل وقال کی
ان کی گرمی کو ترستی ہے جبیں اطفال کی

اک جنوں پرور بگولا ہے وہ علم بے وثوق
جس کی رو میں کانپنے لگتے ہیں شوہر کے حقوق

دور ہی سے ایسے علم جہل پرور کو سلام
حُسن نسواں کو بنا دیتا ہو جو جاگیرِ عام

جس جگہ حوران جنت کا کیا ہے تذکرہ
کیا کہا ہے اور بھی کچھ ہم نے جز حسن وحیا ؟

تذکرہ حوروں کا ہے محض ایک تصویرِ جمال
ہم نے کیا ان کو کہا ہے صاحبِ فضل وکمال ؟

ہیچ ہے ہر چیز، زیور، غازہ، افشاں، رنگ وخال
حُسن خود اپنی جگہ ہے سو کمالوں کا کمال

چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار
علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار ؟

روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موجِ ماہتاب
کیا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب ؟

میرے عالم میں نہیں اس بد مذاقی کا شعار
کاکُلِ "افسانہ" ہو "دوشِ حقیقت" سے دوچار

حُسن کا آغوش رنگیں، دلفریب و دلربا
علم سے بن جائے اقلیدس کا محض اک دائرہ

مصحفِ روئے کتابی رو کشِ نازِ گلاب
اور بن جائے لغت یا دفترِ علمِ حساب

نغمۂ شیریں کے دامن میں ہو شورِ کائنات
بزم کاوش میں جلے شمعِ شبستانِ حیات

گرم ہو تیزاب کی کھولن سے لالے کا ایاغ غنچۂ نورس کا طاق اور رہبرِ مکتب کا چراغ
شہپرِ بُلبُل پہ کھینچی جائے تصویرِ شغال! موتیوں پہ ثبت ہو طوفان کی مہرِ جلال!
صبح غرقِ بحث ہو، غنچے کھلانے کے عوض درس دیں موجیں صبا کی گنگنانے کے عوض!
تو نہ کرنا مغربی متوالیوں کی ریس دیکھ گھات میں تیری لگا ہے فتنۂ ابلیس دیکھ
تو نہ ان کی طرح بھرنا عرصۂ فن میں چھلانگ کوکھ تا ٹھنڈی رہے بچوں سے اور صندل سے مانگ
دخترانِ مغربی کو دے نہ عورت کا خطاب یہ مجسّم ہو گئے ہیں کچھ گنہگاروں کے خواب
پھر رہی ہیں یا تری نظروں کے آگے پرفشاں عورتوں کے بھیس میں شیطان کی سرتابیاں
علم حاصل کر فقط تدبیرِ منزل کے لیے وہ دماغوں کے لیے ہیں اور تو دل کے لیے

فاختہ کی آواز

آج تو فاختہ کی نرم آواز
ہے کچھ اس طرح غرقِ سوز و گداز

جیسے پیری میں یادِ طفلی آئے
جیسے جل جل کے شمع بجھ بجھ جائے

جیسے یعقوب غرقِ شیون میں
جیسے سیتا کی جستجو بن میں

شب کو جس طرح دل میں درد اٹھے
بیوگی نو عروس کی جیسے

شام کو زیرِ سایۂ کوہسار
جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار

جیسے جو بر نہ آئی ہو وہ مراد
جیسے بچھڑے ہوؤں کی دل میں یاد

جیسے اشکوں کی لہر سینے میں
پانی آنے لگے سفینے میں

جیسے سسرال میں کوئی لڑکی
دیکھ کر بدلیوں کو ساون کی

صبح پنگھٹ کی نیم کے نیچے
مائکے کی گھٹائیں یاد کرے

اعترافِ عجز

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں — صدرِ معنی، داورِ الفاظ، امیرِ شاعراں
اور خود میرا بھی کل تک خیر سے تھا یہ خیال — شاعری کے فن میں ہوں منجملۂ اہلِ کمال
لیکن اب آئی ہے جب اک گونہ مجھ میں پختگی — ذہن کے آئینے پر کانپا ہے عکسِ آگہی
آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں — اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں
جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی — اتنی لا محدود دنیا اور میری شاعری
الاماں آفاق کا دل اور یہ طغیانِ سوز — اب کھلا مجھ پر کہ اک طفلِ دبستاں ہوں ہنوز
زلفِ ہستی اور اتنے بے نہایت پیچ و خم — اڑ گیا رنگِ تعلی، کھل گیا اپنا بھرم
میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے — کچھ سیاسی رنگ ہے، کچھ عاشقانہ رنگ ہے
کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال — اک اچٹتا سا جمال، اک سر بہ زانو سا جلال
میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور — ایک طفلانہ بلوغ، اک کھوکھلا سن شعور
میرے قصرِ شعر میں غوغائے فکرِ ناتمام — ایک درد انگیز درماں، اک شکست آمادہ جام
گاہ سوزِ چشم و ابرو، گاہ سازِ نادنوش — گاہ خلوت کی خموشی، گاہ جلوت کا خروش
چہچہے کچھ موسموں کے زمزمے کچھ جام کے — دیرِ دل میں چند ٹکڑے مرمریں اصنام کے

چند زلفوں کی سیاہی، چند رخساروں کی آب / گاہ حرفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب

وہ بھی کچھ جاگیردارانہ بہ قولِ ناقداں / بے سواد و بستۂ رسم و رہِ رومانیاں[۱]

وصل کے دو چار نغمے، ہجر کی اک آدھ آہ / قعر سے ناواقفیت، سطحِ دریا پر نگاہ

گاہ مرنے کے عزائم، گاہ جینے کی امنگ / بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ

اتنی اوچھی رنگ سازی سے کھلا جاتا تھا میں / اتنی عبرتناک سطحیت پہ اتراتا تھا میں

بے خبر میں تھا کہ دنیا راز اندر راز ہے / یہ وہ گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے

جو یہاں اظہر من الشمس و چراغ طور ہے / وہ درخشاں چیز بھی اک حلقۂ بے نور ہے

یہ سہانا بوستاں سرو و گل و شمشاد کا / ایک پل بھر کا کھلنڈرا پن ہے ابر و باد کا

ہر ترنم ہے دلِ خوں بستہ کی اک موجِ زہر / ہر تبسم ہے خراشِ سینہ کی ہلکی سی لہر

شرم، شوخی کی تھکاوٹ، عشوہ، عجزِ دلبری / ناز، اک رنگیں سہارا، نازکی اک لاغری

بوئے گل کیا، ایک عیارانہ شوخی گرد کی / زمزمے کیا، ایک خوش فعلی ہے آہِ سرد کی

برق، بینائی پہ اک ضربِ سحابِ تیرگی / شعلۂ جوّالہ، قرطاسِ کتابِ تیرگی

اس محلِ آب و گل میں یہ حیاتِ آدمی / گربہ کی صرف ایک پل بھر موش سے بازی گری

ابتدا و انتہا کا علم نظروں سے نہاں / ٹمٹماتا سا دیا، دو ظلمتوں کے درمیاں

جہل کا اک قہقہہ ہر ادعائے آگہی / موت کا اک مسخراپن ماجرائے زندگی

---

۱ ROMANCA

روشنی بن کر اکڑتا پھر رہا ہے برملا — تہ بہ تہ تاریکیوں کا خندۂ دنداں نما
انجمن میں تخلیے ہیں، تخلیوں میں انجمن — ہر شکن میں اک کھچاوٹ، ہر کھچاوٹ میں شکن
عام معمولاتِ دنیا، واقعاتِ صبح و شام — فکرِ انسانی کے محبس، عقلِ انسانی کے دام
ہر گماں میں اک یقیں سا، ہر یقیں میں سو گماں — ناخنِ تدبیر بھی خود ایک گتھی بے اماں
روشن امیدوں کی پیشانی میں غلطاں ابرِ سیم — ہر سوادِ گیسوئے پُرخم صراطِ مستقیم
ایک اک گوشے سے پیدا وسعتِ کون و مکاں — ایک اک خوشے میں پنہاں صد بہارِ جاوداں
جنگ میں پیغامِ رحمت، سنگ میں پیکِ بہار — پرنیاں میں تیغ کی باڑھ، آب میں آہن کی دھار
لیلیٰ سنجیدگی کے لب پہ سرمستی کا حرف — برف میں شعلے تپاں، شعلوں کی طراری میں برف
تخم کے سینے میں غلطاں گلستانوں کے نکات — خاک کی چٹکی میں پرافشاں قوائے کائنات
ہر کرن اک ابر، ہر تعبیر اک ژولیدہ خواب — ہر سحر اک دیو شب، ہر جلوہ اک بکر حجاب
ہر نمایاں نقش، اک پنہاں فریبِ ابصار کا — ہر گلِ شاداب، اک بہروپ بیابانِ خار کا!
ہر خزف الماس، ہر زنجیر تارِ عنکبوت — ہر کلید اک قفل، ہر جھنکار اک جولاں سکوت
پیکرِ ہستی میں ڈھیلا ہے مظاہر کا لباس — اور میں اس کی ذرا سی اک شکن سے روشناس
برق کی لہروں کی وسعت الحفیظ والاماں — اور میں صرف کوندے کی لپک کا رازداں
رازداں کیا، مدح خواں اور مدح خواں بھی کم سواد — نا بلد، نادان، ناواقف، ندیدہ، نامراد
خارج از وہم و گماں ہے عمر لیلائے زمیں — اور اک لمحے کی پیمائش پہ میں قادر نہیں

کیوں نہ پھر سمجھوں سبک اپنے سخن کے رنگ کو
نطق نے الماس کے بدلے تراشا سنگ کو

لیلیٔ آفاق الٹتی ہی رہی پیہم نقاب
اور یہاں عورت، مناظر، مشقِ صہبا، انقلاب

دائمی قدروں کی ہر ساعت گہر پاشی رہی
اور یہاں وقتی مسائل ہی کی عیاشی رہی

غرفہ ہائے لعل و گوہر آسماں کھولا کیا
اور میں رندِ سیہ رو کو ٹکے تولا کیا!

پا رہا ہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات
کیونکہ اب پیشِ نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات

کائنات اک کارگاہِ سطوت و کاخِ جلال
جلوہ گر جس کے نقائص میں بھی روحِ صد کمال

یہ کھنچی الجھی زمیں، یہ پیچ در پیچ آسماں
الاماں والاماں والاماں والاماں

ایک منا سا ستارہ ایک ننھا سا شرار
یہ تزلزل، یہ تلاطم، یہ تموج، یہ فشار!

اک نفس کا تار اور یہ شورِ عمرِ جاوداں
اک کڑی اور اس میں زنجیروں کے اتنے کارواں

اک تبسم اور اتنے خون صالح کے نجوم
ایک مبہم نقش اور اتنی شعاعوں کا ہجوم!

ایک اک لمحے میں اتنے کاروانِ انقلاب
ایک اک ذرّے میں اتنے ماہتاب و آفتاب

یہ گرج، یہ برق، یہ طوفاں، یہ صرصر، یہ سموم
بندگانِ چند اور اتنے خداؤں کا ہجوم

لَے کی جنبش اور اتنے حلقہ ہائے بے شمار
نَے کی کروٹ اور یہ ہنگامۂ رقصِ شرار

اک صدا اور اس میں یہ لاکھوں ہوائی دائرے
جس کے شعبوں کو اگر چن لے تو دنیا گونج اٹھے

ایک پرتو اور فضائے بیکراں پر جست و خیز
اک دیا اور آندھیوں کی فوج سے گرمِ ستیز

ایک بوند اور ہفت قلزم کے ہلا دینے کا جوش
ایک گونگا خواب اور تعبیر کا اتنا خروش

کوہ کی رفعت میں اتنی پستیوں کے خط و خال   کاہ اور اتنے عناصر کے مساعی کا مآل

اک ہیولا اور یہ اشکال و اسما کا ہجوم   جہلِ مطلق کے سیہ خانے میں یہ رقصِ علوم

بہرِ یک ساعت، برائے تابشِ یک بامداد   اتنی سعیٔ آب و آتش اتنی جہدِ برق و باد

ایک شبنم اور اتنے تند شعلوں کی ترنگ   ایک حرف اور اتنے پہلو اک نظر اور اتنے رنگ

اک کلی اور اس میں صدیوں کی متاعِ رنگ و بو   صرف اک لمحے کی رگ میں اور قرنوں کا لہو

ہر قدم پر نصب اور اسرار کے اتنے خیام   اور اس منزل میں میری شاعری امیر الکلام!

جس میں راز آسماں ہے اور نہ اسرارِ زمیں   ایک خس، اک دانہ، اک جو، ایک ذرہ بھی نہیں

نوعِ انسانی کو جب مل جائے گی رفتارِ نور   شاعرِ اعظم کا تب ہو گا کہیں جا کر ظہور

خاک سے پھوٹے گی جب عمرِ ابد کی روشنی   جھاڑ دے گی موت کو دامن سے جس دن زندگی

جب قوائے بحر و بر پر آدمی ہو گا سوار   جب بنے گا بندۂ مجبور الٰہِ روزگار

جب ہماری جوتیوں کی گرد ہو گی کہکشاں   تب جنے گی نسلِ آدم شاعرِ جادو بیاں

فکر میں کامل نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں میں   کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں میں

کہستانِ دکن کی عورتیں

یہ ابلتی عورتیں، اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگ اسود کی چٹانیں، آدمی کے روپ میں

واہ کیا کہنا ترا، اے حُسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے رنگیں شباب

ہر سراپا، بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تند چشمے، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں بیمثال

عورتیں ہیں، یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب

یہ جواں چہرے یہ چہروں میں ہے برنائی کا جوش
تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس، الحفیظ والاماں
لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی بٹی سی کاکلیں
آہن و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہے ان کا فربتوں کا رنگ روپ
کھپ چکی ہے جس میں بارش، ڈس چکی ہے جسکو دھوپ

ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی، الاماں
پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں

کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں

کیا خبر کتنے دلوں کی جو تش پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

فتنۂ خانقاہ

اک دن جو بہر فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ ہونٹوں پہ دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لاالٰہ

برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں دلوں میں لرزہ بر اندام ہو گیا

یوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دل کہ روح سے اٹھنے لگے دھواں ہلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں

پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہو گیا
ہر مرغ خلد حُسن کا پروانہ ہو گیا

اس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں نہ پوچھ نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں نہ پوچھ
رخ پر ہوائے شام کی گلباریاں نہ پوچھ کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں نہ پوچھ

عالم تھا وہ خرام میں اس گلعذار کا
گویا نزول رحمتِ پروردگار کا

گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لیے ہوئے
چوگاں کے خم میں گوئے دل و جاں لیے ہوئے
رخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لیے ہوئے
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لیے ہوئے
آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لَو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ عشوہ آہن گداز کی
لہریں ہر ایک سانس میں سیلابِ ناز کی
پلٹیں ہوا کے دوش پہ زلفِ دراز کی
آئینے میں دمک رخِ آئینہ ساز کی
آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر، کاکلِ شبگوں کے دام میں
موجیں شرابِ سرخ کی آنکھوں کے جام میں
رنگِ طلوعِ صبح رخِ لالہ فام میں
چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں
انساں تو کیا یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈوبی ہوئی تھی جنبشِ مژگاں شباب میں
یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق کہ نمی تھی گلاب میں
یا اوس موتیے پہ شبِ ماہتاب میں
آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

ہات اس نے فاتحہ کو اٹھائے جو ناز سے آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہہ دل نواز سے دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے

پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک پیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

فارغ ہوئی دعا سے جو وہ مشعلِ حرم کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم

انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنم کدے میں کرن پھوٹنے لگی

ہر چہرہ چیخ اٹھا کہ ترے ساتھ جائیں گے اے حسن تیری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اس جگہ سے اپنا مصلےٰ اٹھائیں گے قربان گاہ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے

کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے تری بارگاہ میں

سورج کی طرح زہد کا ڈھلنے لگا غرور پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرور رخ کی جوان لَو سے پگھلنے لگا غرور

ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زہد سرخ ہوئی اور گل گئی

پل بھر میں زلفِ لیلیٰ تمکیں بگڑ گئی
دم بھر میں پارسائی کی بستی اجڑ گئی
جس نے نظر اٹھائی، نظر رخ پہ گڑ گئی
گویا ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی

طوفانِ آب و رنگ میں زہاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد حدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے
انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے
کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے

القصہ دین، کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

کل رات کو

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہرباں تھا وہ بتِ نامہرباں کل رات کو

"ناز" تھا طغرا کشِ دیوانِ آدابِ نیاز
"تیغ" تھی پیغمبرِ امن و اماں کل رات کو

چھو رہی تھی دل کو موجِ رنگ تیوروں کے عوض
کھنچ رہی تھی ابروؤں کی یوں کماں کل رات کو

لوٹتی تھی کس تکلف سے ہوا کے دوش پر
چاندنی میں کاکلِ عنبر فشاں کل رات کو

اللہ اللہ فرشِ مے نوشی کی اوج اندیشیاں
فرش پا انداز تھا کون و مکاں کل رات کو

الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
ہر کلی کو آ رہی تھیں ہچکیاں کل رات کو

مسندِ زریں پر "سرِ دلبراں" کے زمزمے
تھے بہ اندازِ "حدیثِ دیگراں" کل رات کو

کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالم تاب پر
سنبلستاں کا تھا گل پر سائباں کل رات کو

پھول تھے غرقِ عرق، پانی ہوئے جاتے تھے جام
سرخ تھیں اس شوخ کی یوں انگھڑیاں کل رات کو

آ رہی تھی جنبشِ مژگانِ عالم کی صدا
یوں لبِ گل رنگ تھا افسانخواں کل رات کو

کیا تلاطم تھا کہ میری کشتیٔ امید میں
کاکلِ شب رنگ کا تھا بادباں کل رات کو

غیب کے پردے سے آوازیں مبارکباد کی
آ رہی تھیں کارواں در کارواں کل رات کو

سامنے تھی جلوہ گاہِ کرسی و لوح و قلم
اک دریچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو

ہر سخن میں گونجتی تھی اسمِ اعظم کی صدا ہر نفس تھا اک حیاتِ جاوداں کل رات کو
وقت کے ہاتھوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو
وہ ترنم تھا کہ علم و عقل کے ہوتے ہوئے زیست کی سی شے تھی اک جنسِ گراں کل رات کو
چاندنی، دریا، شگوفے، راگنی، بربط، شراب پھٹ پڑی تھیں بزم پر رنگینیاں کل رات کو
نرگسِ مخمور و آبِ آتشین و موجِ گل ہر طرف تھیں سرخیاں ہی سرخیاں کل رات کو
گردنِ مینا جھکاتے ہی ابل پڑتے تھے جام گنگنا اٹھتا تھا یوں پیرِ مغاں کل رات کو
وجد میں تھی جھلملاتی مشعلوں کی روشنی رقص میں تھا پرتوِ رطلِ گراں کل رات کو
ناز کرتی جس طرح گردوں پہ جاتی ہے دعا اٹھ رہا تھا مشعلوں سے یوں دھواں کل رات کو
محفلِ زہرا میں تھا ہنگامۂ رقص و سرود آسماں پر بج رہی تھیں چوڑیاں کل رات کو
میں بھی لافانی ہوں مثلِ وجہ ربِ ذوالجلال دل کو ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو
جوشؔ کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی نعمتیں! حیف! اک تو ہی نہ تھا اے رازداں کل رات کو

جوانی کی رات

شب، کہ حریمِ ناز میں شورِ صد اضطراب تھا — عشق بھی تھا برہنہ سر، حسن بھی بے نقاب تھا

آنکھوں میں روئے یار تھا، آنکھیں تھیں روئے یار پر — ذرہ تھا آفتاب پر، ذرے میں آفتاب تھا

خشک تکلفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب حدیں — چشمکِ بے دریغ تھی، خندۂ بے حجاب تھا

حسن کی بزمِ عشوہ میں شمعِ وفا تھی ضو فگن — عشق کی بارگاہ میں، زمزمہ باریاب تھا

سر پہ صراحیاں لیے رقص کناں تھے مغ بچے — نرگسِ نیم باز میں، رنگِ شرابِ ناب تھا

معرکۂ عظیم تھا ناز میں اور نیاز میں — زلف میں بھی تھی برہمی، دل کو بھی پیچ و تاب تھا

موجِ ہوا میں عطر تھا، چھٹکی ہوئی تھی چاندنی — پھول تھے صحنِ باغ میں، چرخ پہ ماہتاب تھا

عشق کی نبضِ تیز میں دوڑ رہی تھیں بجلیاں — حسن کے دستِ ناز میں شعلہ فشاں رباب تھا

پرتوِ یار اِس طرف، رامش و رنگ اُس طرف — چشم بھی فتح مند تھی، گوش بھی کامیاب تھا

درد سے قلب چور تھے، کیف سے روح مست تھی — سوز بھی بے نظیر تھا، ساز بھی لاجواب تھا

ہونٹوں کو وقتِ گفتگو، چومتی تھی شگفتگی — بات جو تھی سو پھول تھی، پھول جو تھا گلاب تھا

اور سحر کو ہم نشیں! آنکھ کھلی تو کیا کہوں — طاق میں شمع کشتہ تھی، چرخ پہ آفتاب تھا

توبہ شکن گلابیاں، فرش پہ چور چور تھیں — خلد فروش جامِ زر، شرم سے آب آب تھا

نغمۂ رقص و بے خودی، جلوۂ حسن و شاعری — شب کو تھا بحرِ بیکراں، وقتِ سحر سراب تھا
بربط و چنگ کی صدا، ایک فسردہ گونج تھی — شمع و شراب کا سماں، ایک پریدہ خواب تھا
لرزشِ بادہ و خمِ زلفِ سیاہ کے عوض — تھا تو چراغ کشتہ کے دود کا پیچ و تاب تھا
گنبدِ قصرِ عیش میں گونج رہی تھی یہ صدا — رات نہ تھی وہ کیف کی، جوشِ ترا شباب تھا

ہنوز

سُن کہ آئینۂ آغاز ہے انجام ہنوز — دل میں نشتر سا کھٹکتا ہے ترا نام ہنوز
تیری جانب سے نہ نامہ ہے نہ مدت سے پیام — اور یہاں ہے خلشِ نامہ و پیغام ہنوز
ہو چکی ہے ترے گھر صبحِ سعادت طالع — اور مرے خانۂ تاریک میں ہے شام ہنوز
تجھ میں اب ولولۂ عیش و طرب ہے بیدار — اور یہاں غم پہ مصر ہے دلِ ناکام ہنوز
تیرے خلوت کدۂ ناز میں ہے چنگ و رباب — اور یہاں بزمِ تمنا میں ہے کہرام ہنوز
حسبِ اوقات مقرر ہے ترا رامش و رنگ — اور یہاں ایک ہے رنگِ سحر و شام ہنوز
پختہ کاری میں گرفتار ہے اب عقل تری — اور یہاں دل ہے اسیرِ ہوسِ دام ہنوز
رنگ چہرے کا اڑاتا ہے ترا ذکر اب تک — نیند آنکھوں سے چراتا ہے ترا نام ہنوز

اب تری شمع ہے اور خلوتِ محرابِ حرم   یاں چراغاں ہے سرِ رہگذرِ عام ہنوز

تجھ کو اک عمر ہوئی بندِ وفا سے چھوٹے   جانِ محزوں ہے یہاں مرغِ تہِ دام ہنوز

پھر سے کھوئی ہوئی توقیر کے پانے والے   دیکھ تحقیر کے شایاں ہے مرا نام ہنوز

اب ترے سر پہ نہیں ابرِ ملامت کی گرج   اور میں ہوں ہدفِ ناوکِ دشنام ہنوز

خارج از بحث ہے اب تیرا گناہِ الفت   اور محبت کا مرے دل پہ ہے الزام ہنوز

ہو چکی ہے تری ناکردہ گناہی ثابت   اور مرے جرم کا ہے غلغلۂ عام ہنوز

داد دے اے مرے نووارد شہر ناموس   جو تش ہے کوچہ و بازار میں بدنام ہنوز

جہاں میں تھا

شبِ آغوشِ چمن میں صبح خنداں تھی جہاں میں تھا
ہوائے سردِ موجِ آبِ حیواں تھی جہاں میں تھا

زمیں کے چہرۂ رنگیں سے ایسی لَو نکلتی تھی
فلک کی شمع رہنِ طاقِ نسیاں تھی جہاں میں تھا

چمن کے صحنِ رنگیں پر حقائق یوں برستے تھے
لبِ ہر برگ پر تفسیرِ قرآں تھی جہاں میں تھا

سحر تک شمعِ کافوری کے غم رفتار اشکوں میں
تبسم ریز روحِ شبنمستاں تھی جہاں میں تھا

فرازِ ذہن کے رومان پرور ابر پاروں میں
نظر افروز برقِ روئے تاباں تھی جہاں میں تھا

شعاعِ عارضِ افسانہ، رخِ مجازی سے
حقیقت مضطرب و سر در گریباں تھی جہاں میں تھا

صنم بر دوش و کفر انگیز محرابِ کلیسا میں
حرم کی شمعِ ایمانی فروزاں تھی جہاں میں تھا

حقائق کے معطر جامعِ اضداد بستر پر
بہم خوابیدہ روحِ کفر و ایماں تھی جہاں میں تھا

سرشتِ آدم و ابلیس تھی یوں محوِ سرگوشی
خجل آویزشِ یزداں و شیطاں تھی جہاں میں تھا

چمن کے سرد آوارہ خس و خاشاک کے اندر
جہندہ نبضِ رعد و برق و باراں تھی جہاں میں تھا

زراہِ معدلت کوشی زبانِ مریمِ عصمت
جنونِ ذوقِ عصیاں کی ثنا خواں تھی جہاں میں تھا

ستارے نقش بر دیوار تھے مہتاب سکتے میں
مشیت گوش بر آوازِ رنداں تھی جہاں میں تھا

سرشکِ گریۂ پنہاں کی ظلمت خیز تابش میں
نگارِ خندۂ عشرت غزل خواں تھی جہاں میں تھا

عروس وقت کی خواب آفریں آسودہ گامی سے — سبک رفتار نبضِ چرخِ گرداں تھی جہاں میں تھا
کبھی چہرے دمکتے تھے کبھی زلفیں بکھرتی تھیں — حقیقت نیم پیدا نیم پنہاں تھی جہاں میں تھا
کسی چشمِ سیہ کے بزم آرا مست پرتو سے — ہر اک ذرہ میں اک روحِ شبستاں تھی جہاں میں تھا
مہکتے مسکراتے نیم وا غنچوں کے جھرمٹ میں — جوانی کی شکر خوابی پرافشاں تھی جہاں میں تھا
وفورِ آرزوئے جنبشِ دستِ زلیخا میں — عروسِ یوسفیت چاک داماں تھی جہاں میں تھا
قریبِ آب جو میدان کے دھندلے کناروں پر — محبت کا کلیں کھوئے خراماں تھی جہاں میں تھا
ملائک ہی نہ تھے سجدے میں پیشِ آدمِ خاکی — الوہیت بھی زیرِ دامِ انساں تھی جہاں میں تھا

تین فریادیں

(۱) فریادِ اماں

تشنۂ خوں ہے پھر آئینِ جہاں لے ساقی
پھر صراحی سے انڈیل آبِ مغاں لے ساقی
ہاں اٹھا جام کہ پھر "فضلِ خداوندی" سے
دہر ہے کارگہ فتنہ گراں اے ساقی
للہ الحمد کہ پھر خونِ محبت کے عوض
آتشِ بغض ہے رگ رگ میں رواں لے ساقی
کھول میخانہ کہ انساں کی "جواں بختی" سے
بند ہے قفلِ درامن واماں اے ساقی
اپنے میخانۂ افلاس کی جانب ——— للہ
پھیر دے کعبہ و کاشی کی عناں اے ساقی
غرق کر دے مئے گل رنگ میں سینوں کا غبار
ہر نظر ہے تری جانبِ نگراں اے ساقی

(۲) فریادِ زباں

جس کو انسان تو کیا دیو بہ مشکل سمجھیں
زیرِ مشق اب ہے وہ اندازِ بیاں لے ساقی
جس کو سنتے ہیں تو کانوں سے ٹپکتا ہے لہو
اب ان الفاظ کے خنجر ہیں رواں لے ساقی
کرکراہٹ ہے جو فقروں میں تو آواز میں پھانس
اب وہ لہجوں کا سبک لوچ کہاں اے ساقی
جس کے ہر لفظ میں سو پھول مہک اٹھتے ہیں
کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں لے ساقی
ٹھیکرے بیچنے والوں کے پرانے گاہک
بند کرتے ہیں جواہر کی دکاں اے ساقی

(۳) فریادِ زنداں

برہمن شور کرے، شیخ دمادم چیخے — اور مستوں پہ ہو شورش کا گماں اے ساقی
تشنہ کاموں کو کرے غرقِ بلا موجِ سراب — اور جگر میں پڑے آب رواں اے ساقی
تیر برسائیں دلِ خلق پہ ناقوس و اذاں — اور کڑکے سرِ قلقل پہ کماں اے ساقی
پنڈت و پیر کریں جنگ و جدل کی تلقین — اور معتوب ہوں رندانِ جہاں اے ساقی
کیا غضب ہے کہ ملیں اہلِ ہوا کو پر و بال — اور گرفتار ہوں اصحابِ مغاں اے ساقی
کیا قیامت ہے کہ ہو کوثر و گنگا میں فساد — تیغ ہو گردنِ صہبا پہ رواں اے ساقی
ہاں جلا شمع کہ اس خیمۂ زنگاری میں — پھر ہے گونجا ہوا قرنوں کا دھواں اے ساقی
دیر ہے شعلہ فشاں اور حرم صاعقہ بار — پرتوِ ابر یہاں ہے نہ وہاں اے ساقی
سانس روکے ہوئے بیٹھا ہے سیہ خانے میں — جوش سا نغمہ زن و زمزمہ خواں اے ساقی

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

برشہادت مہاتما گاندھی

اے زمیں کی جیب کے آئینۂ الماس بار
اے فلک کی بزم کے مہرِ درخشانِ بہار
اے وطن کی سرزمیں کے آسمانِ ذی وقار
اے زمانے کے صدف کے گوہرِ انجم شکار

اے صفا کی موج کے لعل درخشاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے امیرِ کاروانِ پختہ کارانِ وطن
اے فقیرِ تاجدارِ تاجدارانِ وطن
اے امید و ہمتِ ناکام گارانِ وطن
اے ہلاک عشوۂ رنگین یارانِ وطن

اے شکارِ کج رواں و کور مغزاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

حیف اے جانِ کرم، نخچیر پیکانِ ستم
حیف اے صیادِ عنقائے مسرت، صیدِ غم
حیف اے دودِ چراغِ کشتۂ طاقِ حرم
حیف اے خاکسترِ پروانۂ بیت الصنم

اے شہیدِ اتحادِ نوعِ انساں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

دہر پر تیری شہادت نے یہ ثابت کر دیا حد سے بڑھ کر نیک ہونا کس قدر ہے ناروا
حرفِ حق ہے اہلِ باطل کے لیے طبلِ وغا سخت ہوتی ہے گناہِ بے گناہی کی سزا

السلام اے کشتۂ خیرِ فراواں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

قاتلوں میں قتل انسانی پہ رونا جرم ہے تخمِ نیکی سرزمینِ دل میں بونا جرم ہے
جذبۂ خدمت سے راتوں کو نہ سونا جرم ہے مجرموں کے درمیاں معصوم ہونا جرم ہے

السلام اے پائمالِ ذوقِ عصیاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

دردِ احساسِ یتیمی سے ہر اک دل ہے اداس جادۂ روشن پریشاں، روئے منزل ہے اداس
کون یہ مقتولِ اعظم ہے کہ قاتل ہے اداس صدرِ محفل اٹھ گیا، محفل کی محفل ہے اداس

اے ابوالہند اے خدیوِ کشورِ جاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تو انوکھا چارہ فرما، طرفہ ترّوم ساز تھا تیری پلکوں کے جھپکنے کا عجب انداز تھا
ہر جھپک میں خوش دلی کا سازِ بے آواز تھا روح پہ تیری عیاں مہر و وفا کا راز تھا

مسندِ حسنِ عمل کے اے غزلخواں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

السلام اے سینۂ اقوام کے دردِ نہاں　　السلام اے مرہمِ زخمِ دلِ ہندوستاں
السلام اے دستگیر و چارہ سازِ بیکساں　　السلام اے آہِ سردِ تیرہ بختانِ جہاں
السلام اے اشکِ گرمِ سینہ چاکاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تیرے ہر آغاز میں رعنائیٔ انجام تھی　　تیرے میداں میں سیاست مرغِ زیرِ دام تھی
تیرے دستِ آگہی میں نبضِ خاص و عام تھی　　سطوتِ افرنگ تجھ سے لرزہ بر اندام تھی
اے گدائے خانہ بر اندازِ شاہاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے مریضوں کے طبیب، اے خستہ جانوں کے کفیل　　اے بہ خلوت موجِ زمزم، اے بہ جلوت رودِ نیل
آتشِ نمرودِ عصرِ نو کے بے پروا خلیل　　حریت کے درسِ اعظم، حق کے پیغامِ جلیل
آشتی کے حکم، دل داری کے فرماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تو امینِ مرحمت، آئینۂ ایثار تھا　　صحتِ افکارِ انساں کے لیے بیمار تھا
برہمن کا چارہ فرما، شیخ کا غمخوار تھا　　تو رواداری کا دیوتا، امن کا اوتار تھا
السلام اے کعبہ و کاشی کے درباں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے گل افسردۂ بستانِ حق وراستی اے سرودِ رفتۂ بزمِ نشاطِ زندگی
اے شبِ مسروقۂ زلفِ درازِ دلبری اے چراغ مردۂ محرابِ امن وآشتی
اے متاعِ بُردۂ گیتا وقرآں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

السلام اے آسمانِ صدق کے مہرِ مبیں السلام اے محفلِ اخلاق کے مسند نشیں
السلام اے فرشِ خاک آلود کے عرشِ بریں السلام اے خاتمِ مہر ومحبت کے نگیں
السلام اے عصرِ حاضر کے سلیماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

جادۂ حق پہ درخشاں ہیں ترے نقشِ قدم پرفشاں ہے آسمانِ عدل پہ تیرا عَلَم
اے حسین ابن علی کے پیروِ قدسی حشم اے یزیدِ عصرِ نو کے کشتۂ ذوقِ ستم
اے صلیبِ تازہ کے عیسیٰ دوراں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تیرے طبلِ جنگ میں بھی سازِ موجِ گنگ تھا تیرے شیشے کے مقابل زرد روے سنگ تھا
خون کی آلودگی سے پاک تیرا رنگ تھا اسلحہ سے بے خبر ترا مذاقِ جنگ تھا
السلام اے فاتحِ بے تیغ وپیکاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے محرم کے افق کی رنگ پرور صبحِ عید اے محلِّ یاس و نومیدی کی گل بانگِ امید
اے ثنا خوانِ حسین و دشمنِ شمر و یزید اے رذیلوں کی رذالت کے لیے ضربِ شدید
اے شریفوں کی شرافت کے نگہباں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے خطیبِ دوستی، اے دشمنِ بغض و عناد اے وفا کی آرزو، اے قلبِ رحمت کی مراد
اے رسولِ عافیت، اے کشتۂ دیوِ فساد بر تو حیف اے سعیٔ ناشکورِ امن و اتحاد
اے پریدہ ولولے، پژمردہ ارماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تو ہی اک دانائے کامل بزمِ نادانی میں تھا روشنی کا تو منارہ بحرِ طغیانی میں تھا
تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا
اے غرورِ ہندو و فخرِ مسلماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے ہوائے گرم سے پژمردہ باغِ مشک بار اے جفائے سنگ سے بشکستہ جامِ زرنگار
موت کے مارے ہوئے اے زندگی کے تاجدار اے خزاں کی دھوپ میں سوئے ہوئے پیکِ بہار
اے اجل کی ظلمتوں کے آبِ حیواں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

ذرے ذرے تیرے بر ستا تھا جلالِ قیصری
حیف اے لیلائے حریت کے قیس عامری

ہر تری موجِ نفس تھی اک سرودِ رہبری
تیرے سینے میں دھڑکتا تھا دلِ پیغمبری

اے نوائے انبیائے پاک داماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے مرے عشرت ندیدہ رہبرِ عبرت مآل
اے مرے گردن بریدہ عزم اتمام و کمال

اے مرے حیواں دریدہ یوسف قدسی جمال
اے مرے صرصر رسیدہ بوستانِ حال و قال

اے مرے خاور گزیدہ شبنمستاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

جب سے تو اے بلبلِ شیریں زباں خاموش ہے
مہر بر لب گلستاں ہے، باغباں خاموش ہے

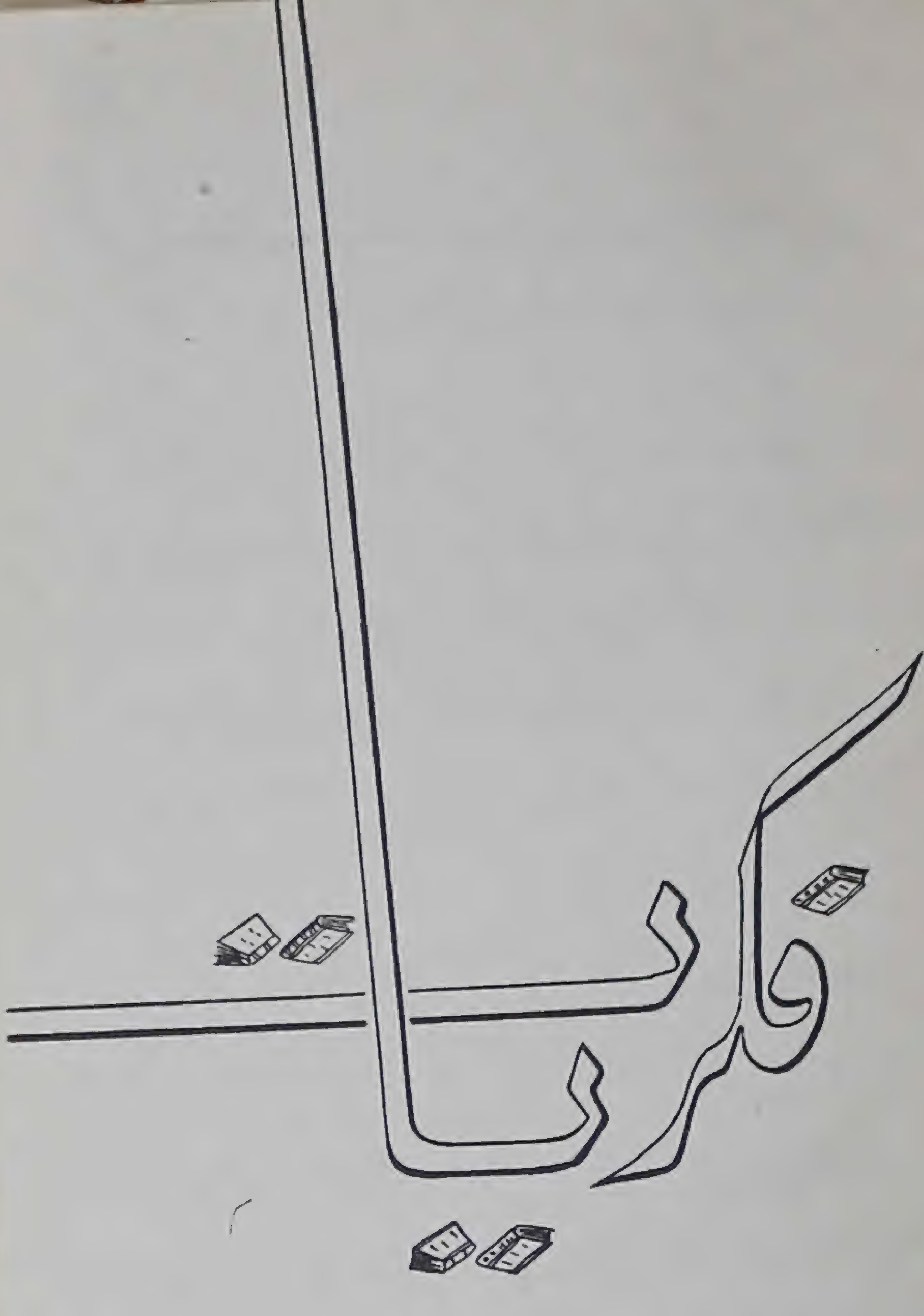
بوئے گل آزردہ ہے، جوئے رواں خاموش ہے
گلشنِ دیرینۂ ہندوستاں خاموش ہے

السلام اے ساکنِ شہرِ خموشاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اہلِ کیف و صاحبانِ ہوش کے آرامِ جاں
جملہ مردانِ اخوت کوش کے آرام جاں

ہر دلِ پر شورش و خاموش کے آرام جاں
قبلۂ رندانِ عالم جوش کے آرام جاں

اے تب و تابِ امامِ بادہ نوشاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام



فکریات

نقّاد

رحم اے نقادِ فن! یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو

شاعری اور منطقی بحثیں، یہ کیسا قتلِ عام
بُرشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام

کیوں اٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کے لیے؟
کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے جھکنے کے لیے؟

اے ادب ناآشنا! یہ بھی نہیں تجھ کو خیال
تنگ ہے بزمِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال

منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دل پذیر
کاش اس نکتہ کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر

یعنی اکیلے سے لبِ ناقد کو کھلنا چاہیے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تُلنا چاہیے

شعر فہمی کے لیے ہیں جو شرائط بے خبر
سوچ تو پورا اترتا بھی ہے اس معیار پر؟

جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا تونے داغ؟
آنچ سے جس کی غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ؟

دل سے اپنے پوچھ او زندانیٔ علمِ کتاب
حُسنِ قدرت کو کبھی دیکھا ہے براَفگندہ نقاب؟

تو پتہ اسرارِ ہستی کا لگاتا ہے کبھی؟
عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی؟

کیا وہاں بھی اڑ کے پہنچا ہے کبھی اے نکتہ چیں؟
کانپتا ہے جس فضا میں شہپرِ روح الامیں

خامشی کی نغمہ ریزی پر بھی سر دھنتا ہے تو
قلبِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے تو

اُن بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب
خاک کو پرچھائیاں جن کی بناتی ہیں گلاب

جو تبسم چھین لیتے ہیں شبِ مہتاب سے　　جن کی برنائی جگاتی ہے دلوں کو خواب سے
سچ بتا تو بھی ہے کیا اے کشتۂ صد حرص و آز　　رازدانِ کاکلِ شبرنگ و چشمِ نیم باز
تیری نبضوں میں بھی مچلی ہے کبھی بجلی کی رَو　　سوزِ غم سے تیرا دل بھی کیا کبھی دیتا ہے لَو
سچ بتا اے عاشقِ دیرینۂ فکرِ معاش　　زہر میں تریاق کے عنصر کی بھی کی ہے تلاش ؟
مجھ سے آنکھیں تو ملا اے دشمنِ سوز و گداز　　تجھ پہ کیا اضداد کی توحید کا افشا ہے راز ؟
تیری راتوں کی سیاہی میں بھی اے ظلمت مآب　　کیا کبھی طالع ہوا ہے مسکرا کر آفتاب ؟
تو گیا بھی ہے نگارِ غم کی محمل کے قریب ؟　　آنچ سی محسوس ہوتی ہے کبھی دل کے قریب ؟
طورِ معنی پر کبھی اے نافہم چڑھ سکتا ہے تو ؟　　کیا مصنف کی کتابِ دل کبھی پڑھ سکتا ہے تو ؟
یہ نہیں تو پھیر لے آنکھیں یہ جلوہ اور ہے　　تیری دنیا اور ہے، شاعر کی دنیا اور ہے
شعر کی تحلیل سے پہلے مری تقریر سُن　　خود زبانِ شعر سے آ شعر کی تفسیر سُن
دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار　　نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ترکیب ادب　　ڈھل کے گو وہ "گوہرِ غلطاں" کا پاتی ہیں لقب
اور ہوتی ہیں تجلی بخش تاجِ زرفشاں　　پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں
جن کے اسرار درخشاں روح کی محفل میں ہیں　　سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں
شاعری کا خانماں ہے نطق کا لوٹا ہوا　　اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر　　ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر

جاگتے رہتے ہیں دل کی محفلِ خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کے آغوش میں

رگ جن کی جانگدازی سے ہیں دل بگڑے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے

شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال
سانس کی گرمی سے اس شیشے میں پڑ جاتا ہے بال

جام میں آتے ہی اڑ جاتی ہے شاعر کی شراب
ٹوٹ جاتا ہے کنارے آتے آتے یہ حباب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے حیرت کی بات
"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات

"شعر" کیا جذبِ دروں کا ایک نقشِ ناتمام
"مشتبہ سا اک اشارہ" ایک مبہم سا کلام

کیف میں اک لغزشِ پا کلکِ گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سی لبِ گفتار کی

ایک صوتِ خستہ و موہوم، سازِ ذوق کی
مرتعش سی ایک آواز انتہائے شوق کی

بے حقیقت نے کے اندر "زمزمہ داؤد" کا
"عارضِ محدود" پر اک عکس "لا محدود" کا

"شعر" کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال
شعر کیا ہے؟ عشق و حکمت کا مقامِ اتصال

ظلمتِ ابہام میں پرچھائیں تفصیلات کی
پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرات کی

جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں
ٹوٹنا رنگیں ستارہ کا اندھیری رات میں

"شعر" کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ لحنِ دلنشیں
"شعر" کیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا یقیں

"شعر" کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا

"ترزبانی اور خاموشی کی مبہم گفتگو
لفظ و معنیٰ میں توازن کی نہفتہ آرزو

بادلوں سے ماہِ نو کی اک ابھرتی سی ضیا
جھانکنا قطرہ کے روزن سے عروسِ بحر کا

مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں

تو سمجھتا تھا، جو کہنا چاہیے تھا، کہہ گیا
پوچھ شاعر سے، کہ وہ کیا کہہ سکا، کیا رہ گیا

کون سمجھے "شعر" یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے، ویسے نہیں

ظلمتیں

تیرگی لپٹی ہوئی ہے دہر میں ہر ضو کے ساتھ
عربدہ کرتا ہے یاں ہر راستہ رہرو کے ساتھ

لعلِ شیریں کے تبسم میں ہے غلطاں آہِ سرد
ظلمتوں کی رو بھی ہے قندیلِ زر کی لَو کے ساتھ

ہر نفس! با ایں ہمہ برنائی و افسوں گری
بیوگی کا دبدبہ بھی ہے عروسِ نو کے ساتھ

اس قدر بھی ناز فرماتا ہے کوئی اے چمن
دھوپ بھی ہے ابرِ رنگا رنگ کے پرتو کے ساتھ

حُسنِ شیریں و غرورِ تاج کے ہوتے ہوئے
تیشۂ فرہاد کا دھڑکا بھی ہے خسرو کے ساتھ

انجمن میں رات کو چپکے سے پا جاتا ہے بار
فتنۂ ظلمت نشاں بھی روشنی کی رَو کے ساتھ

ڈوب جاتا ہے تڑپ کر سینۂ دریا میں جوش
سوز و پیچ و تاب بھی تنویرِ ماہِ نَو کے ساتھ

ہم لوگ

خزاں کے جَور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ — مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ
ہر ایک سانس ہے گو صد ہزار حشر بدوش — مگر پیامِ ثبات و قرار ہیں ہم لوگ
جلال چھو نہیں سکتا ہے باد و باراں کا — وہ دستِ غیب کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ
زمیں سے کرتے ہیں ناز اور آسماں سے غرور — وہ کبر دوست کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ
عیاں ہیں جن پہ تہی دستیاں سلاطیں کی — لباسِ فقر میں وہ شہریار ہیں ہم لوگ
جہاں میں ہیں مگر اہلِ جہاں سے کام نہیں — وطن میں رہ کے غریب الدیار ہیں ہم لوگ
کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار ہمیں — مثالِ جوئے رواں بے قرار ہیں ہم لوگ
جوانیوں کو ہمیں سے ملی ہے نعمتِ ناز — وہ رازِ طرۂ زلفِ نگار ہیں ہم لوگ
فشردۂ غمِ ہستی سے کھینچتے ہیں شراب — بساطِ عیش پہ وہ بادہ خوار ہیں ہم لوگ
چمن میں سنتے ہیں ہر صبح نغمۂ الہام — امینِ زمزمۂ شاخسار ہیں ہم لوگ
جگر ہے وقت کا اپنی جناب میں صد چاک — وہ فاتحِ غمِ لیل و نہار ہیں ہم لوگ
حیات و موت کی پست و بلند راہوں میں — خرامِ ابر سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ
نفس میں سنتے ہیں آہٹ کسی کے قدموں کی — نہ پوچھ کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

وہ جبر دوست جسے "اختیار" کہتے ہیں — اس اختیار سے بے اختیار ہیں ہم لوگ

محیطِ سکۂ مغلوب کے تلاطم میں — سفینۂ زرِ کامل عیار ہیں ہم لوگ

حیات کی ابدی رات کے اندھیرے میں — چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہیں ہم لوگ

بجھے پڑے ہیں زمانہ کے ہاتھ سے ہر چند — مگر بہمیرِ برق و شرار ہیں ہم لوگ

ادب سے آؤ ہمارے حضور اہلِ نظر — جہانِ حسن کے پروردگار ہیں ہم لوگ

نگاہ رو بہ رو، اے روحِ نعمتِ دارین — بہ ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

بس اس خطا پہ کہ ہیں محرمِ رموزِ حیات — شکارِ کشمکشِ روزگار ہیں ہم لوگ

پیمبرانہ بد دعا

جو بن پڑے گا تو سب سے بڑی سزا دوں گا
زمانہ ساز! تجھے میں یہ بد دعا دوں گا

ملے نہ آتش دوزخ کی تجھ کو نرم سزا
ملے وہ سوز جو ہوتا ہے شاعروں کو عطا

رموزِ دہر سے بڑھ جائے رسم و راہ تری
جبین زیست پہ پڑنے لگے نگاہ تری

تجھے حقائقِ ہستی کا کھولنا آجائے
کلی کو خار کے کانٹے پہ تولنا آجائے

عدو پہ بھی تری فطرت شفیق ہو جائے
ترے خمیر کا لوہا رقیق ہو جائے

دماغ سرحدِ قدرت سے متصل ہو جائے
ہر ایک ذرۂ ناچیز جزو دل ہو جائے

وہ طبع سخت میں پیدا ہو انقلاب عظیم
کہ تیرے قلب میں چبھنے لگے گلوں کی شمیم

ترے دیار میں طوفانِ آرزو آجائے
ترا ضمیر، محبت کے روبرو آجائے

نہ بہرہ ور ہو کبھی مرگِ ناگہانی سے
خدا دوچار کرے طول زندگانی سے

درِ حیات، تری چشمِ دل پہ وا ہو جائے
نظر مآلِ تبسم سے آشنا ہو جائے

بلائے قہرِ خدا تجھ کو دیدہ ور کر دے
لطیف کر کے حسوں کو لطیف تر کر دے

انگیٹھی

بچپن کی اے اداس انگیٹھی! خدا گواہ — کیا کہیے تجھ پہ آج پڑی کس طرح نگاہ
تو اور خاکِ سرد پہ یوں مثلِ سوگوار — افسوس اے زمانۂ طفلی کی یادگار
میری ہی طرح کیا ترا پہلو بھی سرد ہے؟ — کیا تیرے آئینے پہ بھی ماضی کی گرد ہے؟
افسوس وہ نشاط کے موسم، وہ زمزمے — جاڑوں کی دلفریب وہ راتیں، وہ چہچہے
شعلوں سے تیرے ہائے وہ اٹھتا ہوا دھواں — وہ قہقہوں کی گونج وہ شیریں پہیلیاں
خوشبو وہ تیری آنچ کی جاں بخش و دلنواز — وہ تیرگی میں رنگ ترا، دل میں جیسے راز
شعلے وہ سرخ سرخ دلوں میں تپے ہوئے — وہ سرخیوں میں نرم تبسم گھلے ہوئے
شعلوں کے بار بار وہ انداز دل نشیں — دم بھر میں زرنگار تو دم بھر میں سرنگیں
ڈوبی ہوئی حیات ہیں وہ تیری گرمیاں — وہ گرمیوں میں لطف کے قصوں کی نرمیاں
وہ سادگی کی بزم میں بجتے ہوئے ستار — کلیوں کا کوئلوں کی چٹکنا وہ بار بار
وہ غنچگی کا عہد، وہ گل باریاں تری — اڑتی ہوئی ہوا میں وہ چنگاریاں تری
وہ نرم نرم جسم، وہ تیسری حرارتیں — وہ ذمہ داریوں سے معرّا شرارتیں

وہ چھوکرے ادب سے دروں میں کھڑے ہوئے
دایاؤں کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے

ماماؤں کی صفوں میں وہ مغلانیوں کی شان
رکھا ہوا وہ تخت پہ چاندی کا پاندان

وہ تیرے گرد و پیش، بصد شانِ افتخار
آواز پاندان کے کھلنے کی بار بار

شایانِ آفریں وہ خواتین کا شعار
شوخی کے رنگ میں بھی وہ اک نوع کا وقار

وہ ہیکلیں گلوں میں، لبوں پر وہ لالیاں
ہلتی ہوئی وہ کانوں میں سونے کی بالیاں

وہ لونڈیوں کے رخ پہ نشاں خاک دھول کے
جوڑے وہ اونچے اونچے وہ موباف تول کے

وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھسے ہوئے
رعب آفریں دروں میں وہ پردے چھٹے ہوئے

وہ نچلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار
پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار

ہلکی رضائیوں کی وہ افسانہ باریاں
اطلس کی سرخ گوٹ پہ وہ سرخ دھاریاں

وہ "ایک بادشاہ" کی بیٹی کا ذکرِ خیر
وہ ولولے جنوں کے، وہ پریوں کا شوق سیر

وہ مرحمت میں غرق بڑی بوڑھیوں کی ذات
وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ

وہ اک عجیب شانِ طرب سے ملی ہوئی
شیریں حکایتوں میں سروتوں کی راگنی

کیوں اب بھی یاد ہیں وہ لڑکپن کے زمزمے ؟
اے شمعِ خوابگاہِ فراغت جواب دے

جن کو بھلا رہی ہیں ہماری جوانیاں
اب ان میں تجکو یاد ہیں کتنی کہانیاں

فریبِ ہستی

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی — کہ گھٹ کے آرزوئے تخمِ گل نہ رہنے پائے
مٹا کے نقشِ دوئی صید رنگ و بو کے لیے — مہین جال سے بن کر زمیں کی تہہ میں بچھائے
کثافتوں میں لطافت کی شمع روشن کی — نمو کی ظلمتِ افسردہ میں چراغ جلائے
گھٹا کی جیب تراشی، فضا پہ ڈالے دام — قدم پہ شمس کے تڑپی، قمر کے ناز اٹھائے
گذشتہ زہرہ جبینوں کے دل نشیں ذرات — نفس کی لو پہ بڑے اہتمام سے پگھلائے
جمالِ خاک نشیں کو دکھائی راہِ فلک — جمودِ زیرِ زمیں کو تپش کے راز بتائے
تری زمین سے لی، آسمان سے گرمی — صبا سے عطر نچوڑا کرن سے رنگ چرائے
بھگو کے رنگ میں ذرّات کی بنائیں تہیں! — اور ان تہوں میں تکلف کے ساتھ نقش بنائے
گرہ لگائی پھر اک مثلِ نرگسِ مخمور — اور اس طرح کہ ہواؤں کی رَو میں کھلتی جائے
اور ان تمام مراحل کے بعد ایک کلی — چمن فروز ہوئی پتیوں سے منہ کو چھپائے
سحر کے وقت بالآخر کھِلی، گلاب بنی — مشامِ جاں کو کیا مست، بوستاں مہکائے
اور اس کے بعد جو دیکھا غروب کے ہنگام — پڑی ہوئی تھی سرِ خاک ناوکِ غم کھائے
یہ کیا نظام ہے معبود! بزمِ ہستی کا؟ — کھلے جو صبح کو، وقتِ غروب کمھلا جائے

جو ایک پل میں ہو تعمیر ماہ و سال خراب تو کس امید پہ کوئی فریب ہستی کھائے
"بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد است بیار بادہ کہ بنیادِ عمر بر باد است"

روشنیاں

صرف ظلمت ہی نہیں ہے، دیکھ تنویریں بھی ہیں کاوشِ تخریب کی ہلچل میں تعمیریں بھی ہیں
جس جگہ خورشید کی حدت سے ہے عالم خموش واں کسی دیوار کے سایہ میں تقریریں بھی ہیں
جس جگہ مایوسیاں ہیں گردشِ تقدیر سے واں کہیں امید کی پوشیدہ تدبیریں بھی ہیں
جس جگہ ژولیدہ عقدوں سے ہیں عقلیں سرنگوں واں حیات و مرگ کی تابندہ تفسیریں بھی ہیں
جس جگہ منڈلا رہے ہیں مبہم و تاریک خواب واں کسی گوشے میں ان خوابوں کی تعبیریں بھی ہیں
جس جگہ تعزیر کے شایاں ہے ذوقِ نقش و رنگ واں کہیں آئینوں میں رنگین تصویریں بھی ہیں
جس جگہ پانی میں ہے زہرِ ہلاہل کا اثر واں ہوا میں چشمۂ حیواں کی تاثیریں بھی ہیں
جس جگہ دوڑی ہوئی ہیں سنگِ خارا کی رگیں واں درخشاں جوہروں کی نرم تحریریں بھی ہیں
ٹوٹتا ہے سلسلہ کب زلفِ عنبر بیز کا میں نے مانا طوق بھی ہے، جوش، زنجیریں بھی ہیں

سہاگن بیوہ

نیک تلسی داس گنگا کے کنارے وقتِ شام
جا رہا تھا اِک طرف بشاش جپتا ہر کا نام

چرخ کی نیرنگیوں سے گفتگو کرتا ہوا
رنگِ عرفاں روح کی تصویر میں بھرتا ہوا

جھاڑیاں تھیں سبز دریا کے کنارے جا بجا
پھول کملائے ہوئے تھے سست تھی موجِ ہوا

راہ میں جالے لگے تھے پتّیوں پر گرد تھی
لانبی لانبی گھاس ہلتی تھی پتا در زرد تھی

جمع تھے اس طرح پتّے جا بجا سوکھے ہوئے
جس طرح شادی کے خیمے صبح کو الٹے ہوئے

جھاڑیوں سے یوں دبے پاؤں گزرتی تھی ہوا
بانسری کی دور سے جس طرح آتی ہے صدا

یوں پڑے تھے زیرِ شاخِ گل شگوفے چاک چاک
جیسے گردِ شمع وقتِ صبح پروانوں کی خاک

طائرِ درماندہ کوئی بول اٹھتا تھا اگر
ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا کوہ و دشت پر

اور سناٹا سا وہ جس میں ہو گم آوازِ رعد
دل پہ ہوتا ہے جو طاری نالۂ پیہم کے بعد

اس طرف رنگِ شفق تھا چرخ پر چھایا ہوا
اس طرف دل کوہ و صحرا کا تھا مرجھایا ہوا

خار و خس پر تتلیاں ہر سو پڑی تھیں بے خبر
ابر کے دو ایک ٹکڑے تھے پریشاں چرخ پر

شام کا چہرہ غمِ پنہاں سے کچھ اترا سا تھا
پانی تھم تھم کر جو بہتا تھا تو سناٹا سا تھا

خود بخود تاریک ساحل پر بھر آتا تھا دل
بڑھ رہی تھی تیرگی رہ رہ کے گھبراتا تھا دل

کہہ رہا تھا رنگ، غم کا ابر چھا جانے کو ہے
سانحہ کوئی قیامت خیز پیش آنے کو ہے

جاتے جاتے ایک گوشہ کی طرف پہنچی نظر
فرطِ غم سے رہ گیا شاعر کا کلیجہ تھام کر

دیکھتا کیا ہے کہ دریا کی روانی ہے اداس
جل رہا ہے اک جنازہ روشنی ہے آس پاس

کانپ کانپ اٹھتی ہے جنگل کی سیاہی بار بار
اٹھ رہے ہیں لاش سے شعلے، فضا ہے بے قرار

روشنی شعلوں کی اک پیشانیٔ زریں پہ ہے
ظلمتِ اندوہ بیوہ کے رخِ غمگیں پہ ہے

ہے رنڈاپا سر پہ شمشیرِ جفا تولے ہوئے
سرنگوں بیٹھی ہے رخ پر کاکلیں کھولے ہوئے

کندنی شعلے ہیں غلطاں چمپئی رخسار ہیں
دل دھڑکنے سے ہے جنبش سی گلے کے ہار میں

اہتمامِ مرگ میں یہ شاعری لبریز یاس
ہاتھ میں مہندی رچی ہے، بر میں چوتھی کا لباس

آہ یہ عالم، کہ اب تک مست ہے موجِ نسیم
آ رہی ہے جسم سے شادی کے پھولوں کی شمیم

کہہ رہی ہے کیا بتاؤں کیا تمنا دل میں ہے
شمع یہ کس کے جنازے کی مری محفل میں ہے

خاک سے اٹھتی ہے پھر کرتی ہے شعلوں کا طواف
کہتی ہے اے شرم کی دیوی! مجھے کرنا معاف

مڑ کے پھر میت سے کہتی ہے اجازت دیجیے
اب تو اس ایندھن کو بھی جلنے کی رخصت دیجیے

آپ کو موت آ گئی، عالم پریشاں ہو گیا
گھر ابھی بسنے نہ پایا تھا کہ ویراں ہو گیا

یاد ہے، ہاں مجھ کو شادی کا ترنم یاد ہے
ہاں، انھیں ہونٹوں پہ آیا تھا تبسم یاد ہے

آپ کے سینے سے شعلے اٹھ رہے ہیں بار بار
جل رہی ہے یہ مری اجڑی جوانی کی بہار

پوچھیے اس سے کہ دنیا کیا تھی اور کیا ہو گئی
جس نے گھونگھٹ بھی نہ الٹا تھا کہ بیوہ ہو گئی

پھنک گئیں میری بہاریں جل گیا میرا سنگار — تیری بند آنکھیں ہیں میری زیب و زینت کا مزار
گھر مرے ہمجولیاں مل جل کے گانے آئی تھیں — مالنیں پھولوں کا گہنا کل پنہانے آئی تھیں
آج قرباں گاہِ عبرت پر چڑھانے کے لیے — موت آئی ہے مرا زیور بڑھانے کے لیے
زندگی جا دور ہو دنیا ہے آنکھوں میں اجاڑ — موت جلدی کر کہ ٹوٹا ہے رنڈاپے کا پہاڑ
کیوں کھڑی ہے دور یوں ڈالے ہوئے تیوری پہ بل — مجھ کو بھی کھا لے قسم ہے تجھ کو او ڈائن اجل
دیکھتی ہے تو کہ میں ہوں کس قدر جینے سے سیر — او سیہ رو موت! خونی موت کیوں کرتی ہے دیر؟
دیکھ میرے رخ پہ اشکوں کی فراوانی کا میل — اپنے جبڑوں کو ہلا تاریک غاروں کی چڑیل!
رینگ ناگن رینگ! مجھ بیوہ کو ڈسنے کے لیے — کیا یہاں آئی ہے منہ اپنا جھلسنے کے لیے
کیوں کھڑی ہے یوں الگ ٹھٹکی ہوئی سچ سچ بتا — میری باتوں نے تجھے کیا موت! برہم کر دیا
یہ اگر ہے! تو جھکا کر میں ترے قدموں پہ سر — مانگتی ہوں درگزر کی بھیک، مجھ پر رحم کر
اے مبارک موت! اے رازِ کمالِ زندگی — اے جہانِ خوابِ نوشیں! اے مآلِ زندگی
اے پیامِ روشنی! اے سرِّ بقا! تاجِ حیات — اے نظامِ دہر! اے رفتارِ نبضِ کائنات
میری ظلمت پر بھی ڈال اپنی انوکھی روشنی — آ، ادھر آ، شاہزادی عالمِ ارواح کی
کہہ کے یہ لپکی چتا کے سمت وہ نازک خرام — اور کہا اے دکھ بھرے سنسار! لے میرا سلام
بس یہ سننا تھا کہ جھپٹے اس کی جانب داس جی — دیکھتے ہی آپ کو، کم سن تو تھی، گھبرا گئی!
ہر طرف پہلے تو دیکھا دل میں کیا کیا ٹھان کے — اور پھر گردن جھکا لی داس کو پہچان کے

ہو گئی فرطِ حیا سے روح غمگیں بے قرار — انگلیاں اپنی مروڑیں دیر تک دیوانہ وار
سر جھکا، ماتھے پہ زلفِ ناز لہرانے لگی — حسن کو آغوشِ غم میں نیند سی آنے لگی
چپ ہوئی تو اور دردِ ہجر دونا ہو گیا — دی صدا دل نے ترا پہلو بھی سونا ہو گیا
یہ صدا سنتے ہی دم الجھا پھریری آ گئی — اک گھٹا دل سے اٹھی، ارض و سما پر چھا گئی
رو کے پھر کہنے لگی، بابا دعا دیجے مجھے — زندگی کے پاپ سے جلدی چھڑا دیجے مجھے
آپ کی داسی پہ اب اس جگ میں رہنا بار ہے — آگ اس چھاتی میں روشن ہے، چتا تیار ہے
جھونک بھی دیجیے مجھے اس آگ کے انبار میں — میں اکیلی ہوں کوئی میرا نہیں سنسار میں
داس نے پھر تو قریب آ کر بہ نرمی یوں کہا — اے مری نادان بچی! سوچ تو کہتی ہے کیا
مرنا جینا ایک ہے جن کو ذرا بھی گیان ہے — وہ اُدھر کا مرتبہ ہے یہ اِدھر کی شان ہے
زندگی ہے نقص سے معمور، اک مہمل سی بات — موت ہے شیرازۂ قانونِ تکمیلِ حیات
موت یکسو، زندگی مجموعۂ اضداد ہے — "زندگی" ہے موت کی پابند موت آزاد ہے
زندگی ہے روح کو محدود کر لینے کا نام ؛ — موت ہے انساں کے لامحدود ہو جانے کا نام
کہتے ہیں فانی جنھیں ہم وہ فنا ہوتے نہیں — مرنے والے اصل میں ہم سے جدا ہوتے نہیں
قیدِ ہستی سے کوئی ذرہ رہا ہوتا نہیں — ٹوٹ جاتا ہے قفس طائر فنا ہوتا نہیں
عشق کے مالے کا اک موتی بکھر سکتا نہیں — اتحادِ باطنی مرنے سے مر سکتا نہیں ؛
عشق کی شاخیں کسی آندھی سے جھک سکتی نہیں — روح کی سرگوشیاں مرنے سے رک سکتی نہیں

زندگی بے روح آوازوں میں دیتی ہے پیام
موت سرد الفاظ کو ٹھکرا کے کرتی ہے کلام

زندگی سے تنگ سانچے میں سما جاتا ہے عشق
موت سے عالم کی پہنائی پہ چھا جاتا ہے عشق

زندگی کی موج پر گلبرگِ تر بنتا ہے عشق
موت کے گرداب میں لعل و گہر بنتا ہے عشق

بادِ طوفانی کے دیوتا پاس آسکتے نہیں
اس دیے کو موت کے جھونکے بجھا سکتے نہیں

موت کیا شے ہے کہ توڑے جبکہ خود روح الامیں
عاشقی کے رشتۂ محکم کو چھو سکتے نہیں

جسم پر بنیادِ عشق خود بنا ہوتی نہیں
روح اس تبدیلِ ہیئت سے فنا ہوتی نہیں

زندگی دھندلا سا اک جلوہ ہے اور کچھ بھی نہیں
موت اک باریک سا پردا ہے اور کچھ بھی نہیں

غور کر دل میں کہ ہو جائے حقیقت بے نقاب
ٹوٹتے دیکھے تو ہوں گے بارہا تو نے حباب؟

مر کے بھی دریا کے سینے سے کہیں جاتے نہیں
رہتے ہیں دریا ہی میں لیکن نظر آتے نہیں

یونہی تیری شمعِ سوزاں بھی تری محفل میں ہے
مرنے والا آنکھ سے اوجھل ہے لیکن دل میں ہے

جو چتا میں جل رہا ہے، وہ ترے پہلو میں ہے
کانپتے ہونٹوں میں ہے، بہتے ہوئے آنسو میں ہے

یہ کہا شاعر نے اور کچھ دیر آنکھیں بند کیں
دیکھتے ہی دیکھتے بیوہ کی آنکھیں کھل گئیں

ہنس کے پھر کہنے لگی، بابا مرا وسواس تھا
دور ہیں جس کو سمجھتی تھی، وہ میرے پاس تھا

یہ کہا اور دفعتاً دل میں چمک پیدا ہوئی
زلف میں تابندگی، رخ پر دمک پیدا ہوئی

صحنِ غم میں باغِ عشرت کی ہوا آنے لگی
کان میں راحت کے نغموں کی صدا آنے لگی

زیرِ لب کہنے لگی، عالم ہے کیا تنویر کا
دل مرا شیشہ ہے ان کی چاند سی تصویر کا

ہے کوئی جلد آئے شادی کا مری ساماں کرے
بدّھیاں آکر پنہائے، مانگ صندل سے بھرے

پھول برسیں جلد انگنائی کو بھرنے کے لیے
زر فشاں طاؤس آئیں رقص کرنے کے لیے

ابر سے کہہ دو کہ میری زلف پہ سایہ کرے
جشن کی دیوی کدھر ہے، بزم میں جلوا کرے

کہہ دو مشاطہ سے آئے، رنج کھونے کے لیے
خم بہ خم زلفوں میں پھر موتی پرونے کے لیے

عشرتِ جاوید باندی ہے مرے احکام کی
اب سکھی! نیرنگیاں عاجز ہیں صبح و شام کی

سرمدی نغموں کو ہے اب ربط میرے ساز سے
آشیاں اونچا ہے میرا وقت کی پرواز سے

حکم رقاصہ کو دو چھاگل پہن کر پاؤں میں
آئے پچھلی رات تاروں کی سہانی چھاؤں میں

خاک تُلسی کی نظر سے رشکِ گلشن ہو گئی
معرفت میں ڈوب کر بیوہ سہاگن ہو گئی

درسِ آدمیت

عزیزو یہ جوشِ رواں بخشِ ہند — یہ مے خوار زاہد، یہ درویش رند

یہ دنیا کا حق کیش باطل نواز — یہ خاور شکن، شاعرِ ذرہ ساز

یہ طاعت پرست و بغاوت پناہ — بہ فطرت سفید و بہ نامہ سیاہ

یہ تعمیر آمادہ تخریب کوش — بہ خلوت سرود و بہ جلوت خروش

یہ صورت گرِ نور و معمارِ نار — یہ سرحلقۂ اولیائے کبار

یہ دانائے رازِ خفی و جلی — گنہ گار معصوم، کافر ولی

گہے شادماں و گہے مضمحل — جہنم در آغوش و جنت بہ دل

یہ چشم و چراغِ نگارِ نجات — بہ ایں ترک و تضحیکِ صوم و صلوٰۃ

بہ ہستی مکدر، بہ مستی نقی! — یہ اس دور کا فاسق متقی!!

یہ تاریک اعمال روشن ضمیر — سیہ کار قدسی قدح خوار پیر

یہ جھوٹی عدالت کا سچا گواہ — یہ سرتا قدم اک مقدس گناہ

خطاؤں کا خوگر، سزاؤں سے دور — یہ قانون داں مجرم بے قصور

یہ دانا و عادل ظلوم و جہول — یہ بے دین مومن، یہ منکرِ رسول!

ندا دے رہا ہے تمھیں صبح و شام
عزیزو یہ رندِ علیہ السلام

کہ آؤ سوئے منزلِ منزلت
پئے رونقِ دینِ انسانیت ؛

محبت کا اس پیر سے درس لو
خس و خار سے بھی محبت کرو

محبت کے سینوں میں غنچے کھلاؤ
شراروں کو کاٹو، ستارے اگاؤ

مساوات انساں کی خاطر مرو
درِ آدمیت پہ سجدے کرو ؛

نہ ہندو شریف اور نہ مسلم شریف
یہ سب ہیں ذلیل و دنی و کثیف

یہ انساں نہیں ہیں یہ چوپائے ہیں
یہ سب اونٹ ہیں اور یہ سب گائے ہیں

یہ قاتل، یہ ڈاکو، یہ شمرِ لعیں
یہ زندانیٔ اسفل السافلین ؛

یہ "زیدا سیے" اور یہ چشتیے
یہ پوّرے یہ اڈّھے یہ باشتیے

بہت سخت گھٹیا ہیں، بونے ہیں یہ
جدید اہرمن کے کھلونے ہیں یہ

میسر نہیں جنس امن و اماں
جہاں بھی ہیں یہ چوٹیاں داڑھیاں

نہ مندر سہانا، نہ مسجد حسیں
درِ آدمیت ہے مہر مبیں

کوئی چیز انساں سے بالا نہیں
ہر اک شے گماں، صرف انساں یقیں

مجاز و حقیقت کا شاہ آدمی
کلاہِ سرِ مہر و ماہ آدمی ؛

بہا بخشِ نجم و گہر آدمی ؛
ضیا سنجِ شمس و قمر آدمی ؛

دُرِ خسلدہ لعلِ یمن آدمی
گل و برگ و سرو و سمن آدمی

امینِ خزاں و بہار آدمی — گلستاں کا پروردگار آدمی
تقاضائے عرش مبیں آدمی — تمنائے فرشِ بریں آدمی
حسین و صبیح و صنم آدمی — نگارِ حدوث و قدم آدمی
زمیں آدمی، آسماں آدمی — الٰہ زمان و مکاں آدمی
نہ ہندو نہ گبر و مسلماں بنو — اگر آدمی ہو تو انساں بنو
نہ انساں بنو گے تو گل جاؤ گے — خود اپنے جہنم میں جل جاؤ گے

پند نامہ

اے مجازؔ[ل] ، اے ترانہ بار مجاز
زندہ پیغمبرِ بہار مجاز !

اے بروئے سمن وشاں گل پوش
اے بکوئے مغاں تمام خروش

اے پرستارِ مہ رخانِ جہان
اے کماندارِ شاعرانِ جواں

تجھ سے تاباں جبینِ مستقبل
اے مرے سینۂ امید کے دل

اے مجازؔ اے مبصرِ خد و خال
اے شعورِ جمال و شمعِ خیال

اے ثریا فریب و زہرہ نواز
شاعرِ مست و رند شاہد باز

ناقدِ عشوۂ شباب ہے تو !
صبحِ فردا کا آفتاب ہے تو !

تجھ کو آیا ہوں آج سمجھانے
حیف ہے تو اگر برا مانے !!

خود کو غرقِ شرابِ ناب نہ کر
دیکھ اپنے کو یوں خراب نہ کر

شاعری کو تری ضرورت ہے
دورِ فردا کی تو امانت ہے

صرف تیری بھلائی کو اے جاں
بن کے آیا ہوں "ناصحِ ناداں"

ایک ٹھہراؤ ، اک "تکان" ہے تو
دیکھ کس درجہ دھان پان ہے تو

[ل] اسرار الحق مجازؔ ردولوی

ننگ ہے محض استخواں ہونا
سخت اہانت ہے ناتواں ہونا

استخوانی بدن، دخانی پوست
ایک سنگین جرم ہے اے دوست

شرم کی بات ہے وجودِ سقیم
ناتوانی ہے اک گناہِ عظیم

"جسم" اور "علم" طرفہ طاقت ہے
یہی انسان کی نبوت ہے

جو ضعیف و علیل ہوتا ہے
عشق میں بھی ذلیل ہوتا ہے

ہر ہنر کو جو ایک دولت ہے
علم اور جسم کی ضرورت ہے

کثرتِ بادہ رنگ لاتی ہے
آدمی کو لہو رلاتی ہے

خوش دلوں کو رلا کے ہنستی ہے
شمعِ اختر[1] بجھا کے ہنستی ہے

اور جب آفت جگر[2] پہ لاتی ہے
رند کو مولوی بناتی ہے

مے سے ہوتا ہے مقصدِ دل فوت
مے ہے بنیادِ مولویت و موت

کان میں سن یہ بات ہے نشتر
مولویت ہے موت سے بدتر

اس سے ہوتا ہے کارِ عمر تمام
اس سے ہوتا ہے عقل کو سرسام

اِس میں انساں کی جان جاتی ہے
اُس میں شاعر کی جان جاتی ہے

یہ زمین آسمان کیا شے ہے
آن جائے تو جان کیا شے ہے

گوہرِ شاہوار چن پیارے
مجھ سے اک گر کی بات سن پیارے

---

[1] اختر شیرانی۔ [2] جگر مرادآبادی۔

غم تو بنتا ہے چار دن میں نشاط — شادمانی سے رہ بہت محتاط!
غم کے مارے تو جی رہے ہیں ہزار — نہیں بچتے ہیں عیش کے بیمار
آن میں دل کے پار ہوتی ہے — پنکھڑی میں وہ دھار ہوتی ہے
جوئے عشرت میں غم کے دھارے ہیں — یخِ شبنم میں بھی شرارے ہیں
ہاں سنبھل کر لطافتوں کو برت — ٹوٹ جائے کہیں نہ کوئی پرت
دیکھ کر شیشۂ نشاط اٹھا — یہ ورق ہے ورق ہے سونے کا
کاغذِ باد یہ نگینہ ہے!! — بلکہ اے دوست آبگینہ ہے
ساغرِ شبنم خوش آب ہے یہ — آبگینہ نہیں حباب ہے یہ،
روک لے سانس جو قریب آئے — ٹھیس اس کو کہیں نہ لگ جائے
تیغِ مستی کو احتیاط سے چھو — ورنہ ٹپکے گا انگلیوں سے لہو،
مستیوں میں ہے تابِ جلوۂ ماہ — اور سیہ مستیاں، خدا کی پناہ
خوب ہے ایک حد پہ قائم نشہ — ہلکا پھلکا، سبک ملائم نشہ
ہاں ادب سے اٹھا ادب سے جام — تاکہ آب حلال ہو نہ حرام
جام پر جام جو چڑھاتے ہیں — اونٹ کی طرح بل بلاتے ہیں
زندگی کی ہوس میں مرتے ہیں — مے کو رسوائے دہر کرتے ہیں
یاد ہے جب جگر[1] چڑھاتے تھے — کیا اُلف ہو کے ہن ہناتے تھے

[1] جگر مرادآبادی

میری گردن میں بھر کے چند آہیں　　　پاؤں سے ڈالتے تھے وہ باہیں
عقل کی موت، علم کی پستی　　　الاماں لعنتِ سیہ مستی
اف گھٹا ٹوپ نشے کا طوفان　　　بھوت، عفریت، دیو، جن، شیطان
لات، گھونسہ، چھڑی، چھری، چاکو　　　لب لپاہٹ، لعاب، کف، بدبو
طنز، آوازہ، برہمی، افساد　　　طعن، تشنیع، مضحکہ، ایراد
شور، ہو حق، ابے تبے، ہے ہے　　　اَدکھیاں، گالیاں، دھمکے، قے
مس مساہٹ، غشی، تپش، چکر　　　سوز، سیلاب، سنسنی، ہَرہَر
چل بچخ، بچخ، چنان چنیں، چنگھاڑ　　　چخ پچخ، چاؤں چاؤں، چیل چلھاڑ
لپاڈگی، لستام، لام، لڑائی　　　ہول، ہیجان، ہانک، ہاتھاپائی
کھل بلی، کاؤں کاؤں، کھٹ منڈل　　　ہُونک، ہنگامہ، ہم ہمہ، ہل چل؛
الجھن، آوارگی، ادھم، اینٹھن　　　بَھونک، بَھوں بَھوں، بھنن بھنن، بَھن بَھن
دھول دھپا، دھکڑ پکڑ، دھتکار　　　تہلکہ، تو تڑاق، تف، تکرار!
بُو، بھبک، بھبے، ہکس، بررر، بھونچال　　　دبدبے، دندناہٹیں، دھمال!
گاہ نرمی و لطف و مہر و سلام　　　گاہ تلخی و ترشی و دُشنام
عقل کی موت علم کی پستی　　　الاماں لعنت سیہ مستی؛
صرف نشے کی بھیگنے دے مسیں　　　ان کو بننے نہ دے کبھی مونچھیں

الاماں، خوفناک، کالا نشہ　　اوہ، ریش و بروت والا نشہ

اژدرِ مرگ و دیوِ خوں خواری　　الاماں نشۂ "جٹا دھاری"

نشے کا "جھٹ پٹا" ہے نورِ حیات　　"جھٹ پٹے" کو بنا نہ کالی رات

نشے کی تیز روشنی بھی غلط ؛　　چودھویں کی سی چاندنی بھی غلط

ذہن انساں کو بخشتا ہے جمال　　نشہ ہو جب بہ قدرِ نورِ ہلال ؛

غرفۂ عقل بھیڑ تو، اکثر!　　پر اسے کچ کچا کے بند نہ کر!

رات کو لطف جام ہے پیارے　　دن کا پینا حرام ہے پیارے

دن ہے عفریتِ آز کی کھنکار　　رات پازیبِ ناز کی جھنکار

دن ہے خاشاک، خاک، دھول دھواں　　رات آئینہ، انجمن، افشاں

دن مسلح، دواں، کمر بستہ　　رات، طاق و رواق و گل دستہ

دن ہے فولاد، سنگ، تیغ، عَلم　　رات — کمخواب، پنکھڑی، شبنم

دن ہے شیون، دہائیاں، دکھڑے　　رات — مست انکھڑیاں، جواں مکھڑے

دن کڑی دھوپ کی بد آہنگی　　رات — پچھلے پہر کی سارنگی ؛

دن بہادر کا بان، بیر کی رتھ　　رات — چمپا کلی، انگوٹھی نتھ

دن ہے طوفانِ جنبش و رفتار　　رات — میزانِ کاکل و رخسار

آفتاب و شراب ہیں بیری　　بوتلیں دن کو ہیں کچھل پیری

کر نہ پامال حرمتِ اوقات
رات کو دن بنا نہ دن کو رات

پی ـــ مگر صرف شام کے ہنگام
اور وہ بھی بہ قدرِ یک دو جام!

وہی انساں ہے خرم و خورسند
جو ہے مقدار و وقت کا پابند

میرے پینے ہی پر نہ جا مری جاں
مجھ سے جینا بھی سیکھ، میں قرباں

اُس کے پینے میں رنگ آتا ہے
جس کو جینے کا ڈھنگ آتا ہے

یہ نصائح بہت ہیں بیش بہا
جلد سو، جلد جاگ، جلد نہا!

باغ میں جا طلوع سے پہلے
تا نگارِ سحر سے دل بہلے،

سرو و شمشاد کو گلے سے لگا
ہر چمن زاد کو گلے سے لگا

منہ اندھیرے فضائے گلشن دیکھ
ساحل و سبزہ زار و سوسن دیکھ

گاہ آوارہ ابر پارے دیکھ
ان کی رفتار میں ستارے دیکھ

جیسے کہرے میں تابِ روئے نکو
جیسے جنگل میں رات کو جگنو!

گُل کا منہ چوم، اک ترنم سے
نہر کو گدگدا تبسم سے

جسم کو کر عرق سے نم آلود
تا کہ شبنم پڑھے لہک کے دُرود

پھینک سنجیدگی کا سر سے بار
ناچ، اچھل، دندنا، چھلانگیں مار

دیکھ آبِ رواں کا آئینہ
دوڑ ساحل پہ تان کر سینہ

مست چڑیوں کا چہچہانا سُن
موجِ نوشتق کا ترانہ سُن

بوستاں میں صبا کا چلنا دیکھ — سبزہ و سرو کا مچلنا دیکھ
شبنم آلود کر سخن کا لباس — چکھ دھندلکے میں بوئے گل کی مٹھاس
شاعری کو کھلا، ہوائے سحر! — اس کا نفقہ ہے تیری گردن پر
رقص کی لہر میں ہو گم لبِ نہر — یوں ادا کر عروسِ شعر کا مہر!!
جذب کر بوستاں کے نقش و نگار — ذہن میں کھول مصر کا بازار
نرم جھونکوں کا آبِ حیواں پی — بوئے گل، رنگ شبنمستاں پی
گن گنا کر، نظر اٹھا کر پی — صبح کا شیر دغدغا کر پی!!
تاکہ مجرے کو آئیں کل برکات — دولتِ جسم و علم و عقل و حیات
یہ نہ طعنہ، نہ یہ اُلہنا ہے — ایک نکتہ بس اور کہنا ہے
غیبتِ نور ہو کہ کثرتِ نور — ظلمتِ تام ہو کہ شعلۂ طور!!
ایک سا ہے وبال دونوں کا — تیرگی ہے مآل دونوں کا
درخورِ صاحبِ مآل نہیں — ہر وہ شے جس میں اعتدال نہیں
شادمانی سے پی نہیں سکتا — جس کو ہوکا ہو جی نہیں سکتا
اے پسر، اے برادر، اے ہم راز — بن نہ اس طرح دُور کی آواز
کوئی بیمار تن نہیں سکتا — خادمِ خلق بن نہیں سکتا
خدمتِ خلق فرض ہے تجھ پر — دورِ ماضی کا قرض ہے تجھ پر

عصرِ حاضر کے شاعرِ خود دار
قرض داری کی موت سے ہشیار
ذہنِ انسانیت ابھار کے جا
زندگانی کا قرض اتار کے جا
تجھ پہ ہندوستان ناز کرے
عمر تیری خدا دراز کرے

جمال و جلال

کیوں اک طرف ہی کھینچتے ہو دوستانِ نو
اک وضع پر نہیں ہے مرے ولولوں کی رَو
کعبے کا نور ہوں تو کبھی بت کدے کی ضَو
گرتی ہے گاہ برق، نکلتی ہے گاہ لَو
دریا ہوں اک مقام پہ رہتا نہیں ہوں میں
اک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں ہوں میں
بہنا مرا متاع ہے، بہنا مرا مفاد
وہ خطۂ جمود ہو، یا عرصۂ جہاد
وہ راہ برگ و بار ہو، یا کوئے برق و باد
بہنا مری حیات ہے، بہنا مری مراد
پیہم مسافرت ہی میں رہنے سے کام ہے
دن ہو کہ رات نہر کو بہنے سے کام ہے

رقصندہ آرزو ہوں، مچلتی ہوئی امنگ
بہکی سی چال ہوں، تو بدلتا ہوا سا رنگ
میری روانیاں ہیں کہ طغیانِ موجِ گنگ
غلطاں ہیں مجھ میں گوہر و خاشاک و لعل و سنگ

بہتا ہوں بحرِ زیست کے دھارے لیے ہوئے
قطرات کی گرہ میں شرارے لیے ہوئے

وہ نغمہ ہوں کہ جس کی نہیں کوئی ایک لَے
وہ نالہ ہوں کہ ہو نہیں سکتا جو وقفِ نَے
دل میں نہاں ہے دہر کی ہر سرد و گرم شے
تریاق و زہر و زمزم و زہرآب و قند و مَے

شاعر کا دل فقیر بنے اور لکیر کا
سنگم ہوں رودہائے حدید و حریر کا

وابستہ، گاہ "خوب" سے ہوں، گاہ "زشت" سے
دوزخ سے ربط، گاہ تعلق بہشت سے
کعبے سے انس، گاہ عقیدت کنشت سے
گوہر سے کھیلتا ہوں، کبھی سنگ و خشت سے

خاک و خزف بھی جیب میں ہیں مہر و ماہ بھی
رند ہزار پیشہ گدا بھی ہے، شاہ بھی

دل میں ہے رہزنی کا، کبھی رہبری کا رنگ
سر میں کبھی خودی کا، کبھی بے خودی کا رنگ
کرنوں کا رنگ ہے، تو کبھی چاندنی کا رنگ
عاشق کا روپ ہے تو کبھی فلسفی کا رنگ

یہ شاعری ہے، عرش کی بازی گری نہیں
یعنی خدانخواستہ، پیغمبری نہیں

ہمت شکن نشیب، نہ صبر آزما فراز　　عقدے گرہ کشا، تو حوادث ہیں کارساز
افشا ہے میرے ذہن پہ دار و رسن کا راز　　وہ قامتِ بلند ہے، یہ گیسوئے دراز

دار و رسن کے نام سے اور میں رمیدہ ہوں
ناگن سے کیا ڈروں گا کہ کاکل گزیدہ ہوں

پتھر کو توڑتی ہے مری ضربتِ شبو　　ناخن سے میرے عقدۂ مشکل ہے زرد رُو
ہر چاک بخشتا ہے مجھے دولتِ رفو　　خود اپنے خونِ گرم سے کرتا ہوں شست و شو

گم ہوں تجلیات میں یوں کائنات کی
جوئے اجل بھی موت ہے آبِ حیات کی

ہر شے نظر فروز ہے میری نگاہ میں　　منزل کا گل کدہ ہے جو کانٹا ہے راہ میں
دُر ہائے تاج مصر ہیں میری کلاہ میں　　ہر چند غوطہ زن ہوں مصائب کی چاہ میں

ہوں چاہ میں بھی آبِ مسرت پیئے ہوئے
پانی ہے بوئے دامنِ یوسف لیے ہوئے

بدہیئتی ہے حسنِ مجسم مرے لیے　　زنجیرِ غم ہے گیسوئے پرخم مرے لیے
شمشیرِ ماہ و سال ہے مرہم مرے لیے　　گھن وقت کا ہے قطرۂ شبنم مرے لیے

پڑتی جمی ہے یوں دلِ آشفتہ کار کی
رکتی ہے سانس ابلقِ لیل و نہار کی

انچاسویں برس میں ہے گو عمر کا قدم
دل میں وہی تڑپ ہے، وہی ولولوں میں رَم
ہر سوز میں ہے سازِ جوانی کا زیر و بم
آتی ہے آسماں سے یہ آواز دم بدم

دبنے نہ دے گمان سے ہرگز یقین کو
اٹھ قوت و حیات سے بھر دے زمین کو

میں فطرۃً ہوں بندۂ اصنام آذری
اور خیر سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
اس وجہ سے ہے عشق میں بھی شانِ صفدری
پہلو میں میرے دیو، تو زانو پہ ہے پری

نظریں جمالِ یار پہ، سر خشت و سنگ پر
اک ہاتھ ہے رباب پر، اک طبلِ جنگ پر

اہلِ وطن کے درد سے آنکھیں ہیں اشکبار
آلودۂ سرشک ہے صہبائے زرنگار
صبحیں سیاہ پوش، تو شامیں ہیں سوگوار
اکثر خوشی کے وقت بھی روتا ہوں زار زار

نصرت غریب کو ہو یہی بس جنون ہے
ہر چند ان رگوں میں امیروں کا خون ہے

یہ کون پڑھ رہا ہے مری بزم میں درود؟
یہ کیا کہ میری ذات میں اے عالمِ شہود
انسانیت ہے خونِ امارت کے باوجود
"مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بُود"

ہاں دشمنِ قوی و رفیقِ ضعیف ہوں
خود اپنی نسل، اپنے لہو کا حریف ہوں

کرتا ہوں چاک دامنِ شاہانِ تند خو | اور یوں کہ تا ابد نہ کبھی ہو سکے رفو!
میری رسن ہے اور سلاطین کا گلو | غلطاں ہے میرے جام میں جمشید کا لہو

رہتا ہوں مست بادۂ گلگوں پیے ہوئے
دوشِ سخن پہ سرخ پھریرا لیے ہوئے

یہ عمر انحطاط، یہ طغیانِ مکر و جنگ | یہ سیل بے دریغ، یہ طوفانِ بے درنگ
یہ جوئے خوں کہ دنگ ہو جس سے غرورِ گنگ | پھر بھی برس رہا ہے مرے دل پہ آبِ رنگ

جن کو مہک ہے زلفِ بتاں سے ملی ہوئی
سینے میں آج بھی ہیں وہ کلیاں کھلی ہوئی

دشتِ سیاسیات میں آتش چکاں بھی ہوں | کوئے جمالیات میں گوہر فشاں بھی ہوں
گل برگ و شاخسار بھی، تیغ و سناں بھی ہوں | ہاں منکرِ خدا بھی، مطیعِ بتاں بھی ہوں

کب صبح و شام راہ سے بھٹکتا نہیں ہوں میں
پر مرکزِ جمال سے ہٹتا نہیں ہوں میں

مردوں کی طرح دیر سے ہوں گرمِ گیر و دار | آتش فشان و برق چکان و شرارہ بار
لیکن درونِ معرکۂ سخت و استوار | اک ہاتھ میں خزاں ہے تو اک ہات میں بہار

آوازِ طبلِ جنگ کی رو میں غنا بھی ہے
کچھ خون ہی نہیں ہے جلو میں حنا بھی ہے

گو دل ہے اور دورِ عبوری کا خلفشار
سینہ ہے پاش پاش تو دامن ہے تار تار
ہر شام زخمِ دشنہ ہے، ہر صبح نوکِ خار
پھر بھی نیاز و ناز کا جاری ہے کاروبار

کھچڑی ہیں بال، پھر بھی وہی شغلِ خام ہے
سینے میں زلف و رخ کی وہی صبح و شام ہے

اے زلفِ مشک پر ور و لے روئے ماہ بار
اے شامِ نجم عشوہ و اے صبحِ مہر کار
اے رقصِ جو، سرودِ صبا، لحنِ آبشار
"گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار"

"لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا"
مانا کہ رہنِ گرمیٔ محفل نہیں رہا

خلوت میں بھی ہوں گرمیٔ محفل لیے ہوئے
ہر اک قدم میں دولتِ منزل لیے ہوئے
حد ہے کہ ہوں دماغ میں بھی دل لیے ہوئے
مقتل میں بھی ہوں پردۂ محمل لیے ہوئے

ہنگامۂ وغا میں بھی دم ٹوٹتا نہیں
حبلِ متینِ زلفِ رسا چھوٹتا نہیں

کام و دہن کو قرب ہے گو جامِ زہر سے
بو آ رہی ہے موت کی انفاسِ دہر سے
ٹکر ہے دیوِ جبر سے، طاغوتِ قہر سے
غافل نہیں ہوں پھر بھی نگارانِ شہر سے

نغموں کی دھن ہے دہر کی اس کاؤں کاؤں میں
پھولوں کو چن رہا ہوں ببولوں کی چھاؤں میں

مولوی

ہوئی اک مولوی سے کل ملاقات
شبیہ قبہ و تصویر منبر

وہی ہوں گے جو فردوس بریں میں
خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر

عمامہ برسر و مسواک در جیب
اُٹنگا پائجامہ، دلق در بر

حنا سے ریش سرخ، آنکھوں میں سرمہ
لٹیں مہکی ہوئی، زلفیں معطّر

جھکے شانے پہ چوخانے کا رومال
عبا کے بند میں تسبیح احمر

کشادہ صدر اور کوتاہ گردن
شکم پر رعب، قد رشکِ صنوبر

لٹیں بکھری ہوئی، آنکھوں پہ عینک
لبیں ترشی ہوئی، داڑھی شکم پر

عبا عناب گوں، دھانی عمامہ
گلوری منہ میں، لب خونِ کبوتر

جبیں کا داغ، اک دہکی ہوئی رات
کمر کا گھیرا اک سمٹا سمندر

بتوں کی چاہ میں ہم رشک مجنوں
خدا کے عشق میں وہ دیو پیکر

وضو کے فیض سے شاداب داڑھی
خدا کے خوف سے چہرہ "گل تر"

سجود بے ریا، ماتھے کی بیندی
درود باصفا، ہونٹوں کا پوڈر

اوامر کی ثنا، ہجو نواہی
حدیثیں برزباں، قرآن ازبر

ارم کے تذکرے کس کس مزے سے — حنائی ریش مٹھی میں پکڑ کر
جبیں گہوارۂ انوار یزداں — زباں آئینۂ خلق پیمبر
مگر آنکھوں میں ہنگام تبسم — ریا کی چشمکیں، اللہ اکبر

نوحۂ آگاہی

زندگی رشتۂ سوزاں ہے یہ معلوم نہ تھا — موت کی لرزشِ مژگاں ہے یہ معلوم نہ تھا
سرخیٔ قشقۂ شاداب و فروغِ افشاں — شعلۂ کسوتِ انساں ہے یہ معلوم نہ تھا
جادوئے لعل و لب و شعبدۂ گوشۂ چشم — فتنۂ شہرِ ظریفاں ہے یہ معلوم نہ تھا
دائے بر جہل کہ ہر زمزمۂ صبحِ وطن — نوحۂ شامِ غریباں ہے یہ معلوم نہ تھا
بوئے گل، نوکِ سناں ہے، یہ خبر تھی کس کو — برگِ گل خنجرِ براں ہے یہ معلوم نہ تھا
غنچہ خمیازۂ خس ہے یہ گماں تھا کس کو — نغمۂ گل بانگِ پریشاں ہے یہ معلوم نہ تھا
ہر گہر اشکِ پشیماں ہے، کسے تھا یہ خیال — ہر ہر شاخ غزالاں ہے یہ معلوم نہ تھا
کوچۂ فقر میں ہر دیدۂ فن کار بزرگ — کاسۂ دستِ گدایاں ہے یہ معلوم نہ تھا
بے حسی شاہِ زماں ہے یہ نظر تھی کس میں — بے دلی فاتحِ دوراں ہے یہ معلوم نہ تھا

گل شاداب ہے اک گریۂ خنداں بہار — ساز اک خندۂ گریاں ہے یہ معلوم نہ تھا

شعر کا رنگ جوانی کی چمن ساز ترنگ — تشنۂ خونِ رگِ جاں ہے یہ معلوم نہ تھا

جس نفس پر ہے رواں کشتیٔ عمرِ انساں — وہ نفس نوح کا طوفاں ہے یہ معلوم نہ تھا

شبنم صبح بہاراں ہے شعاعِ بے مہر — ہر نفس دست و گریباں ہے یہ معلوم نہ تھا

نازشِ تمکنت قطب و ثباتِ کہسار — لرزشِ کاہِ سبک جاں ہے یہ معلوم نہ تھا

سیل آفات کے دھارے پہ حیاتِ انساں — مرگ انفاس بداماں ہے یہ معلوم نہ تھا

خیمۂ نشۂ بالیدہ و محرابِ سرود — سایۂ ابر گریزاں ہے یہ معلوم نہ تھا

دوستو فصلِ بہاراں کی ہوائے جولاں — دشمنِ جیب و گریباں ہے یہ معلوم نہ تھا

فرصتِ مختصر صحبتِ یارانِ شباب — تا ابد ماتمِ یاراں ہے یہ معلوم نہ تھا

فرصتِ شبیب میں ہر نغمۂ جشنِ پیشیں — گریۂ گوشہ نشیناں ہے یہ معلوم نہ تھا

لمس مضرابِ دمادم سے کھنکتا ہر تار — جادۂ شہرِ خموشاں ہے یہ معلوم نہ تھا

وصل کی چند بہاروں کے علاوہ یہ حیات — اک مسلسل شبِ ہجراں ہے یہ معلوم نہ تھا

جس کو بخشا ہے دل سادہ نے رحمت کا خطاب — وہ بھی اک قطرہ کا عنواں ہے یہ معلوم نہ تھا

اب کہاں مشعلِ وجدان و چراغ آیات — فکر غارت گرِ ایماں ہے یہ معلوم نہ تھا

عرش اعظم پہ فرشتوں کی متاع طاعت — علم آدم سے پشیماں ہے یہ معلوم نہ تھا

خاک پر حضرت انساں کی خلافت کا علم — جنبش دامن عصیاں ہے یہ معلوم نہ تھا •

درسِ تہذیب و اطاعت ہے بغاوت کا خروش — "اہرمن" "حکمتِ یزداں" ہے یہ معلوم نہ تھا
آبِ خمخانۂ مستی و شرابِ ہستی — شبنمِ گورِ غریباں ہے یہ معلوم نہ تھا
برگِ سبز و ورقِ نسترن و تختۂ گل — چادرِ قبرِ بہاراں ہے یہ معلوم نہ تھا
دہر گویا تزکِ چشمِ غزالاں کے حضور — خفتِ سرمہ فروشاں ہے یہ معلوم نہ تھا
جوشؔ سا کافر و کافر گر و کافر گفتار — فطرۃً صاحبِ ایماں ہے یہ معلوم نہ تھا

لافانی حروف

لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں — ذہنِ خالق کی حکایت زندگی کی داستاں
جوت ہیرے کی جگائے کوئلے کے انگ میں — دامنِ طرزِ بیاں کو ڈوب دیتی رنگ میں
روشنائی سے چمکتے خال و خط کو ڈھالتی — گیسو و رخسار میں نوکِ قلم کو ڈھالتی
سرمئی سطروں پہ دوڑاتی شعاعِ دل نشیں — سنگِ موسیٰ کو عطا کرتی نقوشِ مرمریں
فکر کو الواستی[1] مسطر کی جوڑے سلک پر — سرخوشی میں رقص فرما کر صریرِ کلک پر
چشمۂ حیواں کو چھلکاتی رہِ ظلمات میں — صبح کے ٹکڑے کو جھلکاتی اندھیری رات میں

---

[1] کورے برتن کو قابلِ استعمال بتانا

دائروں میں بند کرتی گیسوؤں کے پیچ و خم　　سسکیوں کی تھرتھراہٹ زمزموں کا زیر و بم
بت کدے میں آتشِ ابلاغ بھڑکاتی ہوئی　　دل کی پرتیں کھولتی لفظوں کو چٹکاتی ہوئی
اوجِ معنی کو فروغِ کہکشاں دیتی ہوئی　　بے زباں افکار کے منہ میں زباں دیتی ہوئی
ولولوں کو معرضِ تحریر میں لاتی ہوئی　　سیلِ تفصیل کی ہر پور چٹخاتی ہوئی
دل کے خونِ تازہ کی بوندوں کو ٹپکاتی ہوئی　　روئے قرطاس و قلم پر پھول برساتی ہوئی
ناچتی گاتی، تھرکتی، شوخیاں کرتی ہوئی　　سینۂ کاغذ پہ دل کی دھڑکنیں بھرتی ہوئی
بے صدا شیشوں کو معنی کی کھنک دیتی ہوئی　　ولولوں کے آسمانوں کو دھنک دیتی ہوئی
خلعتِ باطن کی زرّیں آستیں چنتی ہوئی　　کلکِ جنباں سے تخیل کی ردا بنتی ہوئی
عارضِ قرطاس کو نوکِ قلم سے چومتی　　دوڑتی، مڑتی، ٹھٹکتی، گنگناتی، جھومتی
کانپتی میزان پر ارض و سما کو تولتی　　ذہن کے عقدوں کو لرزاں ناخنوں سے کھولتی
جیب میں ڈالے سکوتِ شیب و گلبانگِ شباب　　لکھ رہی ہیں داستانِ قعر و تاریخِ حباب
کھپ رہے ہیں سینۂ کاغذ میں سندان و بلور　　ڈھل رہے ہیں دائروں میں لالہ و سرو و طیور
انگلیوں سے گر رہے ہیں زندگی کے آبشار　　خامشی میں بج رہے ہیں فکرِ جولاں کے ستار
لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں صبح و شام　　موجِ گیتی کے ترانے، اوجِ گردوں کے پیام
لکھ رہی ہیں گیت، فریادیں، ترانے، چہچہے　　ہچکیاں، سرگوشیاں، آنسو، دعائیں، قہقہے
قہقہوں کی گونج میں پازیب چھنکاتی ہوئی　　آنسوؤں کو موتیوں کے ہار پہناتی ہوئی

یوں رواں ہیں وقت کے سیلاب میں باصد وقار
نوح کی کشتی ہے گویا دوشِ طوفاں پر سوار

لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں
ماجرا در ماجرا و داستاں در داستاں

بھر چکیں گی انگلیاں جس وقت معنی کے ایاغ
جل اٹھیں گے مجلۂ قرطاس میں لاکھوں چراغ

سرمگیں سطروں کی گلیوں میں بہے گی طرفہ نہر
ساحلوں پر جگمگا اٹھیں گے آگاہی کے شہر

شمسۂ قصرِ ہنر پر جھل جھلائیں گے حروف
تاجِ سلطاں کی دمک پر مسکرائیں گے حروف

جگمگا اٹھیں گے یوں لفظوں میں دُرہائے عدن
شاعروں کی مفلسی شاہوں پہ ہوگی خندہ زن

حرف بن کر یوں دلِ افلاس کے دہکیں گے داغ
جھلملا جائیں گے ایوانِ امارت کے چراغ

دائروں میں رکھ چکیں گی انگلیاں جس وقت دام
نصب ہو جائیں گے کاغذ پر تخیل کے خیام

اور جب نم روشنائی کو سکھا دے گا سفوف
قصر ہائے سنگ بن جائیں گے تب نازک حروف

آئیں گے پھر لشکرِ دوراں کی زد پر یہ قصور
ان پہ جھپٹیں گے سنین ان کو جھنجھوڑیں گے شہور

ہونکتے ارض و سما کڑکائیں گے ان پر کماں
ان کو روندیں گے کروڑوں ڈونگروں کے کارواں

جاہلوں کی ٹولیاں ان کو گرانے آئیں گی
ان پہ اوچھے ناقدوں کی تیوریاں منڈلائیں گی

ان پہ گرجے گا فقیہانِ سبک سر کا خطاب
ان پہ کڑکے گا چھچھورے بادشاہوں کا عتاب

یہ اسالے جائیں گے تاج و کمر کی دھوپ میں
ان کو پھٹکیں گے مبلغ داڑھیوں کے سوپ میں

ان کو مسلیں گی بھیانک ایڑیاں کہسار کی
برچھیاں ان میں چبھیں گی ثابت و سیار کی

ان کو لاکھوں خیرہ سر طوفان ڈھانے آئیں گے
ان سے لاتعداد اندھے زلزلے ٹکرائیں گے

ان کو روندیں گی ہزاروں پلٹنیں ظلمات کی
ان کو کھرچیں گی ہزاروں چھینیاں لمحات کی

ان پہ برسے گی مسلسل آگ، بھونچال، دھوپ، برف
پھر بھی لَو دیتا رہے گا تا ابد ایک ایک حرف

پیش اقطابِ ہنر گردن اٹھا سکتا ہے کون
کعبۂ فن کار کو دنیا میں ڈھا سکتا ہے کون

جھینپتا ہے دیکھ کر ان کے خرابوں کا جمال
خانقاہوں کا تجمل، بارگاہوں کا جلال!

کانپتا ہے انکسارِ طبعِ شاعر کے حضور
بادشاہوں کا تکبر، دیوتاؤں کا غرور

متصل جھکتی ہے بہرِ دولتِ علم و یقیں
ان کے بابِ خانۂ عصیاں پہ عصمت کی جبیں

ان کے لہجے مشعلیں رکھ کر بقا کے طاق میں
گونجتے رہتے ہیں پیہم گنبدِ آفاق میں

قتل ہونے پر بھی ان کا رتبہ کم ہوتا نہیں
حشر تک ان کے قلم کا سر قلم ہوتا نہیں

مانگتی ہے بھیک میں گونگی زمیں ان سے زباں
ان سے آنکھیں مانگنے آتا ہے اندھا آسماں

ان سے ہے بنیاد گویا نازنینِ کائنات
یہ نگاہِ گیتی و گردوں میں آوازِ حیات

ان کے عرشِ زندگی پر عرش برساتا ہے پھول
ان کے دروازوں کو آکر کھٹکھٹاتے ہیں رسول

اور اٹھ جاتے ہیں جب دنیا سے یہ اربابِ راز
دیوتا آتے ہیں پڑھنے کو جنازے کی نماز

نوعِ انسانی کبھی ان کو بھلا سکتی نہیں
موت کی آندھی چراغ ان کے بجھا سکتی نہیں

ہم نشیں! تاریخ شاہد ہے کہ اقطابِ سخن
باندھتے ہیں سر پہ سہرا جب پہنتے ہیں کفن

سانس رکتی ہے تو کارِ نغمہ کرتے ہیں شروع
تیرگی میں ڈوب کر قبروں سے ہوتے ہیں طلوع

نغمۂ پائندۂ گیتا و قرآں کی قسم
جل اٹھے اک بار تو بجھتی نہیں شمعِ قلم

جھینپتی ہے تابشِ تاج و علم کی چاندنی
کھیت جب کرتی ہے شاعر کے قلم کی چاندنی

کون آئے فکر کے تاج و علم کے سامنے
کانپتی ہے تیغِ چنگیزی قلم کے سامنے

طرۂ طرفِ کلہ پر مسکراتا ہے ادب
لرزشِ مژگاں سے تاروں کو بجھاتا ہے ادب

راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے شمعِ قصرِ جم
سرنگوں ہوتی نہیں قندیلِ سرکارِ قلم

موج زن ہوتا ہے جن میں خونِ خاصانِ شعور
کانپتی ہے فوجِ صرصر ان چراغوں کے حضور

اول اول آندھیوں میں سنسناتا ہے ادب
پھر انھیں اپنے چراغوں پر نچاتا ہے ادب

روز و شب کی سلطنت کو فتح کرتے ہیں حروف
قبر میں جاتا ہے شاعر اور ابھرتے ہیں حروف

ناز کر اے دل کہ آہ و ارغنوں کے درمیاں
لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں

عرش

اے زمیں آباد ہو جا آشنائے راز سے
گونج اٹھ اے آسماں، انسان کی آواز سے

اے خموشی بڑھ، رکابِ نطقِ آدم تھامنے
اے پہاڑو سر جھکا دو، آدمی کے سامنے

اپنی تمکیں سے خبردار اے عروسِ بحر و بر
ہو رہا ہے خاک پر اسرارِ حق کا پردہ در

ہاں ابل پڑ سینۂ انگور سے موجِ شراب
شاہدِ آفاق کے چہرے سے اٹھ جا اے نقاب

اے سمندر ہاں ادب کے ساتھ شورِ پیچ و تاب
پاک انساں کے قدم لے لے دہکتے آفتاب

ہاں اٹھ اے آفاق استقبالِ آدم کے لیے
سرو قد ہو اے عناصر، خیر مقدم کے لیے

سختیوں کو ترک کر دو، نرمیوں سے کام لو
ابر و برف و باد، طوفانوں کی باگیں تھام لو

پیشوائی کو ادب سے پیشوائی کو بڑھو
اے کڑکتی بجلیو! اے گھڑگھڑاتے بادلو

اے شگوفو مسکراؤ، آبشارو گیت گاؤ
گنگناؤ اے ہواؤ، اے پرندو چہچہاؤ

بخشتا ہوں لے تجھے روحِ عظیم و نفسِ پاک
ہاں کلاہِ فخر کج کر اے جواں اقبال خاک

ہوش میں آ اے غنودہ فرشِ خاکی ہوش میں
کچھ خبر ہے عرش آتا ہے تری آغوش میں

آدم کا نزول

ذرہ ذرہ سے اٹھی اک تازہ موجِ زندگی
آسمانوں نے علم کھولے زمیں نے سانس لی

بھاپ بن کر چھائی میدانوں پہ روحِ بحر و بر
دید کی خاطر پہاڑوں نے اٹھائے اپنے سر

سنسنائی سینۂ فولاد میں تیغِ دو دَم
پتھروں میں کسمسائے ناتراشیدہ صنم

خفتہ میدانوں میں شہروں کا تخیل جاگ اٹھا
ایک پرتو سا در و دیوار کا پڑنے لگا

لیلیٰ تعمیر کا رخسار لَو دینے لگا
گونج اٹھی کہسار کے سینے میں تیشے کی صدا

حکمِ قدرت کو لیے موجِ ہوا آنے لگی
"باادب، باہوش" کی پیہم صدا آنے لگی

ذوقِ ایجادات و صنعت کا بگل بجنے لگا
آئی طبلِ عالمِ خاکی سے "دوں دوں" کی صدا

اپنے میثاقِ اطاعت کو سنانے کے لیے
آئیں ساری قوتیں عالم کی صف باندھے ہوئے

سامنے آ آ کے اشیا نے بتائے اپنے نام
ہونکتے بپھرے عناصر نے کیا جھک کر سلام

تند طوفانوں کی اکڑی گردنیں خم ہو گئیں
احتراماً قدِ آدم بحر کی موجیں اٹھیں

رکھ کے کشتی میں خواصِ ابر آں بحرِ خراج
نذر کو آیا قوائے کار فرما کا مزاج

جھک گئی ہستی مودّب ہو گئے ارض و سما
شاہدانِ دہر نے وا کر دیے بندِ قبا

روشنی کو سینۂ ظلمت میں راہیں مل گئیں
خاک کے در کھل گئے، کانوں کی باچھیں کھل گئیں

نو عروسِ دہر نے زلفوں کو برہم کر دیا
چاند مجرے کو جھکا، سورج نے سر خم کر دیا

واردات

واردات

جنگل کی شاہزادی

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں / اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا / اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا

تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی / لیلیٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں / طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں / تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا / میں سو رہا ہوں ایسا محسوس ہو رہا تھا

اک کیف موج پرور دل سے گزر رہی تھی / ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی

تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری / ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے / دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

زاہد فریب، گل رُخ، کافر، دراز مژگاں / سیمیں بدن، پری رُخ، نوخیز، حشر ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر / نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر

کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بو / سروِ چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رو

گیسو کمند، مہوش، کافور فام، قاتل / نظارہ سوز، دل کش، سرمست، شمعِ محفل؛

ابرو ہلال، میگوں، جاں بخش، روح پرور   نسریں بدن، پری رخ، سیمیں عذار، دلبر
آہو نگاہ، نورس، گل گوں، بہشت سیما   یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا
غارت گرِ تحمل، دلسوز، دشمنِ جاں ؛   پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں ؛
گلشن فروغ، کمسن، مخمور، ماہ پارہ   "دلبر کہ در کفِ او موم است سنگ خارا"
ہر بات ایک افسوں، ہر سانس ایک جادو   قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو
صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نورِ دیدہ   برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ ؛
چہرے پہ رنگِ تمکیں، آنکھوں میں بے قراری   ایمائے سینہ کوبی، فرمانِ بادہ خواری
لوہا تپانے والی جلوؤں کی ضو فشانی   سکے بٹھانے والی اٹھتی ہوئی جوانی ؛
ڈوبے ہوئے سب اعضا حسنِ مناسبت میں   پالی ہوئی گلوں کے آغوشِ تربیت میں
حسنِ ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں   یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں
حوریں ہزار دل سے قرباں ہو گئی ہیں   رنگینیاں سمٹ کر "انسان" ہو گئی ہیں
چینِ ستم گری سے نا آشنا جبیں ہے   میں کون ہوں؟ یہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے
ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے   رہ رہ کے اڑنے والی چادر سنبھالتی ہے
آنچل سنبھالنے میں یوں بل سے کھا رہی ہے   گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے ؛
کچھ دیر تک تو میں نے اس کو بغور دیکھا   غش کھا رہی تھی عقبیٰ، چکرا رہی تھی دنیا
گاڑی سے پھر اتر کر اس کے قریب آیا   طوفانِ بے خودی میں پھر یہ زباں سے نکلا

اے وردِ آدمیت، اے شاعری کی جنت — اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت
اے روحِ صنفِ نازک، اے شمعِ بزمِ عالم — اے صبحِ روئے خنداں، اے شامِ زلفِ برہم
اے تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی — قدرت کی انتہائی تخئیلِ دل ربائی
چشم و چراغِ صحرا، اے نورِ دشت و وادی — رنگیں جمال دیوی، جنگل کی شاہزادی
بستی میں تو جو آئے اک حشر سا بپا ہو — آبادیوں میں ہلچل، شہروں میں غلغلہ ہو
رندانِ بادہ کش کے ہاتھوں سے جام چھوٹیں — تسبیحِ شیخ الجھے، توبہ کے عزم ٹوٹیں
نظروں سے اتقا کے رسم و رواج اتریں — زہاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اتریں
آنکھیں ہوں اشک افشاں، نالے شرر فشاں ہوں — کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں
شہروں کے مہوشوں پر اک آسمان ٹوٹے — پروردۂ تمدن عشووں کی نبض چھوٹے
اس سادگی کے آگے نکلیں دلوں سے آہیں — جھک جائیں دلبروں کی خود ساختہ نگاہیں
تیری ادا کے آگے شرما کے منہ چھپائیں — ناپے ہوئے کرشمے، تولی ہوئی ادائیں
تیری نظر کی رو سے ہو جائیں خستہ و گم — مشق و مزاولت کے پالے ہوئے تبسم
امن و اماں کے رخ کو بے آب و رنگ کر دے — دنیا کو حسن تیرا میدانِ جنگ کر دے
کتنی ہی قسمتوں کے بدلے فلک نوشتے — خون اور دوستی کے کٹ جائیں کتنے رشتے
تصنیف ہوں ہزاروں چبھتے ہوئے فسانے — ان انکھڑیوں کی زد پر کانپیں شراب خانے
تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا — اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا

یہ بن، یہ گل، یہ چشمے مجھ سے قریب ہوتے
شاعر کے زیرِ فرماں یہ سب رقیب ہوتے

کیوں میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے؟
اے زمزموں کی دیوی، اتنی خموش کیوں ہے؟

بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے
ہاں دے لبوں کو جنبش اے سرمدی ترانے

یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے
یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

سننا تھا یہ کہ ظالم اس طرح مسکرائی
فریاد کی نظر نے، ارماں نے دی دہائی!

عشوہ جبیں پہ لے کر دل کی امنگ آیا
چہرے پہ خون دوڑا آنکھوں میں رنگ آیا

شرما کے آنکھ اٹھائی، زلفوں پہ ہاتھ پھیرا
اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا

چمکا دیا حیا نے ہر نقشِ دلبری کو
دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو

سن کر مری مچلتی آنکھوں کی داستانیں
اُس کی نگاہ میں بھی غلطاں ہوئیں زبانیں

شرما کے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہاتھ پھیرا
دیکھا تو چھا چکا تھا میدان پر اندھیرا

کچھ جسم کو چرایا، کچھ سانس کو سنبھالا
کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لے کے ڈالا

تاریک کر کے میری آنکھوں میں اک زمانہ
جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ

ہونے لگی روانہ، ارماں نے سر جھکایا
دل کی مثال کانپا رہ رہ کے بن کا سایا

بے ہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی
اتنے میں رات لے کر قندیل ماہ نکلی

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

ساون کے مہینے

فردوس بنائے مرے ساون کے مہینے
اک گل رخ دلنشیں بدن و سرو سہی نے

ماتھے پہ اِدھر کاکلِ ژولیدہ کی لہریں
گردوں پہ اُدھر ابر خراماں کے سفینے

مینہ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار
اتنے ہی زمیں اپنی اگلتی تھی دفینے

اللہ رے یہ فرمان کہ اس مست ہوا میں
ہم منہ سے نہ بولیں گے اگر پی نہ کسی نے

وہ مونس و غمخوار تھا جس کے لیے برسوں
مانگی تھیں دعائیں مرے آغوشِ تہی نے

گل ریز تھے ساحل کے لچکتے ہوئے پودے
گل رنگ تھے تالاب کے ترشے ہوئے زینے

بارش تھی لگاتار تو یوں گرد تھی مفقود
جس طرح مئے ناب سے دھل جاتے ہیں سینے

دم بھر کو بھی تھمتی تھیں اگر سرد ہوائیں
آتے تھے جوانی کو پسینے پہ پسینے ؛

بھر دی تھی چٹانوں میں بھی غنچوں کی سی نرمی
اک فتنۂ کونین کی نازک بدنی نے

گیتی سے ابلتے تھے تمنا کے سلیقے ؛
گردوں سے برستے تھے محبت کے قرینے

کیا دل کی تمناؤں کو مربوط کیا تھا
سبزے پہ چمکتی ہوئی ساون کی جھڑی نے

بدلی تھی فلک پر کہ جنوں خیز جوانی
بوندیں تھیں زمیں پر کہ انگوٹھی کے نگینے

شاخوں پہ پرندے تھے جھٹکتے ہوئے شہپر
نہروں میں بطیں اپنے ابھارے ہوئے سینے

اس فصل میں اس درجہ رہا بے خود و سرشار
میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

کیا لمحۂ فانی تھا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا
دی کتنی ہی آواز حیاتِ ابدی نے

چاند کے انتظار میں تارے

کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
حسن دیکھو غریب خانے کا!
روح کو آئینہ دکھاتے ہیں
در و دیوار مسکراتے ہیں!
آج گھر "گھر" بنا ہے پہلی بار
دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار
غرق ہے روح خوش جمالی میں
نظم ہے طبع لاابالی میں
جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا
خوف دل میں فریب قسمت کا
سوزِ قلب کلیم آنکھوں میں
اشک امید و بیم آنکھوں میں
چشم بر راہ شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے
رات بھیگی، شگفتہ بار ہوا
رنگ کلیوں میں آشکار ہوا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں مچلی
ہلکی ہلکی مہک چنبیلی کی!
وعدہ جنجال بن گیا جی کا
رنگِ امید ہو چلا پھیکا
اک جہاں چشم تر میں گرد ہوا
دل وہ دھڑکا کہ رنگ زرد ہوا
دفعتہً اک چمک سی دوڑ گئی
بام و در پر جھلک سی دوڑ گئی
دل میں چمکی امید کی بجلی
انگلیاں اور ہو گئیں ٹھنڈی

الاماں شوقِ دید کی یورش — بڑھ گئی اور خون کی گردش
اپنی حدِ وفا ہوئی محسوس — ان کی آوازِ پا ہوئی محسوس
چھا گئی بام و در پہ رعنائی — دل میں لی ولولوں نے انگڑائی
جل اٹھی شمع دل کے محبس میں — صبح گویا ہوئی بنارس میں
فرطِ شادی سے بوکھلا سا گیا — دل میں احساس شادمانی کا
تارِ نظروں کے دم بہ دم کانپے — لڑکھڑائی زباں، قدم کانپے
نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا — رشتہ سمٹا مری نگاہوں کا
آئے وہ، اشک تھم گئے بارے — چاند نکلا، سبک ہوئے تارے

پہلی مفارقت

چاند سے عہد وصل کی باتیں — ہائے فرقت کی چاندنی راتیں
آفتیں جمع ہیں خدائی کی — چاندنی رات ہے جدائی کی
کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے — رات بھر دل میں درد ہوتا ہے
اٹھتی رہتی ہیں بار بار آنکھیں — ڈھونڈھتی ہیں جمال یار آنکھیں
کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو — نیند آتی نہیں کسی پہلو
چھیڑتا ہے جو کوئی رات کو ساز — صاف آتی ہے یار کی آواز
آگ سی پہلوؤں میں جلتی ہے — ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے
مرغ جب صبح کو جگاتے ہیں — چونکتے ہی وہ یاد آتے ہیں
شغلِ مرگ و حیات کی راتیں — ہائے وہ التفات کی راتیں
بے نتیجہ ہے صبر کی تلقین — بلکہ دیتا ہے جب کوئی تسکین
شعلۂ غم بھڑکنے لگتا ہے — اور بھی دل دھڑکنے لگتا ہے
ہر نفس آہ، ہر سخن نالہ — سَم ہے آب و ہوائے بنگالہ
اے اودھ کی نسیمِ عقدہ کشا — وہ ملیں تو پیام یہ کہنا:

بادلوں کی طرح برستی ہیں آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں
اٹھتی رہتی ہے ہوک سی پیہم ہائے وہ رخ وہ کاکل برہم
ہائے وہ چاندنی وہ مہتابی مست آنکھوں کی وہ شکر خوابی
برگ گل پر وہ ماہتاب کی ضو رخ پہ وہ آمدِ شباب کی رَو
خال و خد سے عیاں بصد انوار صبح صادق کی چاندنی کا نکھار
ہاں تو اے دل نشیں اودھ کی صبا وہ ملیں تو پیام یہ کہنا ؛
بادلوں کی طرح برستی ہیں ؛ آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں ؛
ایک مدّت ہوئی نہیں دیکھا ہائے تیرا وہ چاند سا مکھڑا
اس طرح صبح و شام ہوتی ہے دل دھڑکتا ہے، آنکھ روتی ہے
کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو آگ لگ جائے ایسے جینے کو
تنگ ہے سانس آنے جانے سے اب بُلا لے کسی بہانے سے

الوداع

اے ملیح آباد کے رنگیں گلستاں، الوداع
الوداع اے سرزمینِ صبحِ خنداں، الوداع
الوداع اے کشورِ شعر و شبستاں الوداع
الوداع اے جلوہ گاہِ حسنِ جاناں الوداع

تیرے گھر سے ایک زندہ لاش اٹھ جانے کو ہے
آ گلے مل لیں کہ آوازِ جرس آنے کو ہے

آ، کلیجے میں تجھے رکھ لوں مرے "قصرِ سحر"[1]
اس کتاب دل کے ہیں اوراق تیرے بام و در
جا رہا ہوں تجھ میں کیا کیا یادگاریں چھوڑ کر
آہ کتنے طُور خوابیدہ ہیں تیرے بام پر

روح ہر شب کو نکل کر میرے جسم زار سے
آ کے سر ٹکرائے گی تیرے درو دیوار سے

ہائے کیا کیا نعمتیں تجھ کو ملی تھیں بے بہا
یہ خموشی، یہ کھلے میدان، یہ ٹھنڈی ہوا
وائے یہ جاں بخش بستاں، ہائے یہ رنگیں فضا
مر کے بھی ان کو نہ بھولے گا دلِ درد آشنا

مست کوئل جب دکن کی وادیوں میں گائے گی
یہ سبک چھاؤں ببولوں کی بہت یاد آئے گی

---

[1] جوشؔ کے مکان کا نام

کل سے کون اس باغ کو رنگیں بنانے آئے گا　　کون پھولوں کی ہنسی پر مسکرانے آئے گا
کون اس سبزے کو سوتے سے جگانے آئے گا　　کون ان پودوں کو سینے سے لگانے آئے گا
کون جائے گا قمر کے نازِ اٹھانے کے لیے
چاندنی راتوں کو زانو پر سلانے کے لیے

آم کے باغوں میں جب برسات ہوگی پرخروش　　میری فرقت میں لہو روئے گی چشمِ مے فروش
رس کی بوندیں جب اڑا دیں گی گلستانوں کے ہوش　　کنجِ رنگیں میں پکاریں گی ہوائیں "جوش جوش"
سن کے میرا نام موسم غم زدہ ہو جائے گا
ایک محشر سا گلستاں میں بپا ہو جائے گا

صبح جب اس سمت آئے گی برافگندہ نقاب　　آہ کون اس دلکشا میداں میں چھیڑے گا رباب
اس افق پر شب کو جب انگڑائی لے گا ماہتاب　　چاندنی کے فرش پر لہرائے گا کس کا شباب
جگمگائے گی چمن میں پنکھڑی کس کے لیے
رنگ برسائے گی ساون کی جھڑی کس کے لیے

گھر سے بے گھر کر رہی ہے آہ فکرِ روزگار　　سرنگوں ہے فرطِ غیرت سے اب وجد کا وقار
خلعتِ ماضی ہے جسمِ زندگی پر تار تار　　پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی امارت کا خمار
شمع خلوت میں ہے روشن تیرگی محفل میں ہے
رخ پہ گردِ بیکسی شانِ ریاست دل میں ہے

کوچ کا پیغام لے کر آگیا مہرِ منیر؛   گھر کا گھر ہے وقفِ ماتم زرد ہیں برنا و پیر
رخصتِ بلبل ہے نالاں ہیں چمن کے ہم صفیر   آ رہی ہے کان میں آوازِ گویاؔ[1] و بشیرؔ[2]
چھٹ رہا ہے ہاتھ سے دامن ملیح آباد کا
رنگ فق ہے عزتِ دیرینۂ اجداد کا

کیا بتاؤں دل پھٹا جاتا ہے میرا ہم نشیں   آئیں گے یاں خرمنِ اجداد کے جب خوشہ چیں
آ کے دروازے پہ جیسے ہی جھکائیں گے جبیں   گھر کا سناٹا صدا دے گا "یہاں کوئی نہیں"
جوش و بخشش کا کلیجہ غرقِ خوں ہو جائے گا
میرے گھر کا پرچمِ زر سرنگوں ہو جائے گا

آہ اے دورِ فلک تیرا نہیں کچھ اعتبار   مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار   فکرِ دنیا اور شاعر تف ہے اے لیل و نہار
موجِ کوثر وقف ہو، اور تشنہ کامی کے لیے
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لیے

آ گلے مل لیں، خدا حافظ گلستانِ وطن   اے "امانی گنج[3]"، کے میدان اے جانِ وطن
الوداع اے لالہ زار و سنبلستانِ وطن   السلام اے صحبتِ رنگینِ یارانِ وطن
حشر تک رہنے نہ دینا تم دکن کی خاک میں
دفن کرنا اپنے شاعر کو وطن کی خاک میں

---

[1] جوشؔ کے دادا۔ [2] جوشؔ کے والد۔ [3] وہ میدان جہاں شاعر نے نظارۂ مناظر کی خاطر آبادی سے باہر مکان تعمیر کیا تھا۔

شامِ رخصت

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اداسی، وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے

وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش الاماں
وہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں ہائے ہائے

وہ مرا عشقِ گل افشاں، رشتہ بر پا حیف حیف
وہ ترا حُسنِ جواں سر در گریباں ہائے ہائے

وہ مرے چہرے پہ دردِ غم کے بادل، الاماں
وہ تری پلکوں پہ اشکوں سے چراغاں ہائے ہائے

وہ مرے اطوار میں اندازِ سیلِ بے پناہ
وہ تری آواز میں آثارِ طوفاں ہائے ہائے

وہ جدائی کی ہوا کے تند جھونکے وائے غم
وہ جوانی کا چراغِ زیرِ داماں ہائے ہائے

اِس طرف الجھی ہوئی موجِ حیاتِ یک نفس
اُس طرف بکھرے ہوئے گیسوئے تاباں ہائے ہائے

اِس طرف تاریکیٔ شامِ مریضانِ کہن !
اس طرف آلامِ صبحِ سوگواراں، ہائے ہائے

طاقِ عبرت اور میری شمعِ ہستی حیف حیف
ہالۂ غم اور تیرا ماہِ تاباں، ہائے ہائے

یاں چمکنے ہی پہ برقِ نالۂ درد آفریں !
واں برسنے ہی پہ ابرِ چشمِ حیراں ہائے ہائے

یاں ہر اک تارِ نظر، زنجیرِ پائے عافیت
واں، ہر اک موجِ نفس دیوارِ زنداں ہائے ہائے

یاں لبوں پر جنبشِ آہِ تنک جاں، وانصیب
واں، مژہ میں لرزشِ اشکِ گریزاں ہائے ہائے

حسرتِ دیدار، یاں ہر آن بیتاب و شدید
فرصتِ نظارہ واں بیہم پر افشاں ہائے ہائے

یاں لرزتا سا غرورِ عزم و ہمت ، الحذر — واں جھجکتی سی نگاہ فتنہ ساماں ہائے ہائے
یاں کفِ پا چوم لینے کی بجھی سی آرزو! — واں بغل گیری کا شرمایا سا ارماں ہائے ہائے
تمتماتے ولولوں کی آگ اور تیری جبیں — سنسناتی آنچ اور میرا گلستاں ہائے ہائے
میں سراپا سازِ عشرت اور رہینِ درد و غم — تو مجسم نازکی اور بارِ حرماں ہائے ہائے
وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت وائے شوق! — وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے
اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا — جوشؔ میرا دل ہوا جاتا ہے ویراں ہائے ہائے
اے فغاں بر لب ترنم ، اے خزاں بر کف بہار — جوشؔ تیرے دل کی ویرانی کے قرباں ہائے ہائے

تیرے لیے

دیکھ کیونکر جی رہا ہوں دلربا تیرے لیے
ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لیے

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لیے

میں کہ آغوشِ سکوں میں پا چلا تھا آپ کو
پھر محیطِ کشمکش میں کھو گیا تیرے لیے

حسرتیں دل کی رواں ہیں کارواں در کارواں
ہر نفس ہے ہجر میں بانگِ درا تیرے لیے

آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابن رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لیے

مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لیے

شرع سے درخواست کرتا ہوں کشودِ کار کی
کھٹکھٹاتا ہوں درِ دارالقضا تیرے لیے

آہ اک فتوے کی خاطر کہنا پڑتا ہے مجھے
"شیخ" سے نااہل کو مردِ خدا تیرے لیے

جاہلانِ بے خرد کے ناسزا اقوال کو
ماننا پڑتا ہے بے چون و چرا تیرے لیے

چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس
زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لیے

مشتری جس کا خدا تھا، چند سکوں کے عوض
بیچ دی میں نے وہ جنس بے بہا تیرے لیے

پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لیے

کر چکا ہوں شدتِ حرماں سے تنگ آ کر معاف
ہر فرومایہ کو اپنا خوں بہا تیرے لیے

پوجنا پڑتا ہے ہر کافر کو تیرے واسطے
ماننا پڑتا ہے ہر بت کو خدا تیرے لیے

آہ جو فرشِ حرم پر بھی کبھی جھکتا نہ تھا
میں نے بت خانے میں وہ سر رکھ دیا تیرے لیے

شرط پوری ہو چکی للہ اب تو رحم کر
دیکھ کیا تھا جوش اور کیا ہو گیا تیرے لیے

سونی جنت

ہاں یہی ہے وہ مکاں وہ جنتِ دورِ کہن
کل تھا جس کی انجمن میں حسن صدرِ انجمن

ہاں یہ پل ہے ریل کا، اور یہ چمکتی پٹڑیاں
داستاں در داستاں و داستاں در داستاں

ہاں یہ کھڑکی ہے وہی اور یہ سلاخیں ہیں وہی
جھانکتی تھی جن سے اُس مکھڑے کی میٹھی چاندنی

ہاں یہیں پر پڑ رہی تھی ایک دن ہلکی پھوار
گر رہا تھا سرخ زلفوں کا سنہرا آبشار

چبھ رہی ہے دل میں مثلِ نیشتر کمبخت سانس
یہ مکاں ہے یا کوئی چبھتی ہوئی سینے کی پھانس

آہ یہ در جس پہ شمعِ زندگی کا نور تھا
حیف یہ گھر، جو کلیمِ عصرِ نو کا طور تھا

آج عبرتناک ہے، بے روح ہے، بے ہوش ہے
کل حیات و نغمہ تھا، اب سرد ہے خاموش ہے

گھر کو اندر سے بھی دیکھوں یا سڑک ہی پر رہوں
خیر، اندر بھی چلوں، فرمانِ دل ہے کیا کروں

اُف یہ سرخی کا نشاں، پہچانتا ہوں میں اسے
جانتا ہے یہ مجھے اور جانتا ہوں میں اِسے

ہاں یہاں آرام کرتی تھی وہ تھک جانے کے بعد
ہاں یہاں وہ بیٹھتی تھی غسل فرمانے کے بعد

ہاں یہاں بدلے تھے بے چینی سے زانو ایک دن
ہاں یہاں ٹپکے تھے اُن آنکھوں سے آنسو ایک دن

مسکرا کر اک ادائے نو سے دیکھا تھا یہاں
کاٹ کر دانتوں سے اک دن پان بخشا تھا یہاں

دامنِ جاں سوزنِ سیال سے سیتا تھا میں
ہاں اسی گوشے میں اکثر شام کو پیتا تھا میں

وہ کسی کا درسِ ترکِ میگساری ہائے ہائے   وہ مرا ہنس ہنس کے شغلِ بادہ خواری ہائے ہائے
یاں چھڑا تھا قصۂ سوزِ نہانی ایک دن   اور اُدھر بیٹھے تھے جب برسا تھا پانی ایک دن
آج بھی محفوظ ہیں سونے در و دیوار میں   وہ ترانے کل جو غلطاں تھے لبِ گلبار میں
اب بھی جلوؤں کی شعاعیں پیش و پس تابندہ ہیں   اب بھی ان غرفوں میں لاکھوں بجلیاں رقصندہ ہیں
ذرے ذرے میں کھٹک محسوس ہوتی ہے یہاں   کانپتی ہیں دھندلی دھندلی چمپئی پرچھائیاں
ان ہواؤں میں جوانی کی مہک ہے آج بھی   ساحرانہ لوچ، ترکانہ لچک ہے آج بھی
جن کے ہر اک نقش میں تھا جلوۂ گل ہائے تر   چبھ رہے ہیں آج کانٹے بن کے وہ دیوار و در
خون میں ڈوبا ہوا انسان کا افسانہ ہے   کل جو گھر عشرت سرا تھا آج ماتم خانہ ہے
کون یہ؟ کیسی صدا؟ کس کی صدا؟ یہ کیا کہا؟   "جوش، تنہا جوش، میں تیری اُداسی پر فدا"
اف مرا دل شق ہوا جاتا ہے، یہ کیا راز ہے؟   یہ مرے دل کی صدا ہے، یا تری آواز ہے؟
چھوٹ جائے مرغِ جاں، دامِ نفس سے چھوٹ جا   ٹوٹ جائے رشتۂ عمرِ دو روزہ ٹوٹ جا
اڑ کے خود آ، یا مجھی کو رخصتِ پرواز دے   کس لیے چپ ہو گئی؟ آواز دے آواز دے

تو اگر واپس نہ آتی

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے — حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
ہات آجاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں — دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں
اف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی وہ ابر و باد — وہ ہوائے تندِ باراں، وہ خروشِ برق و رعد
دفعتہً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا — وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا
وہ "اپالو" کے کلیجے کی مچلتی "مان سون" — وہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جنون
اور اس طوفان میں لے زندگی کی روشنی — کود پڑنا وہ سمندر میں ترا ایکبارگی

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے — حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
اِس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے — آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے
موت، اور پھر موت تیری، الحفیظ والاماں — ہڈیوں سے آنچ اٹھتی اور بالوں سے دھواں
لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات — جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات
پہلے ہوتا اک تلاطم، ایک طوفاں، ایک جوش — بعد ازاں تو اور میں اور بحرِ باراں کا خروش

اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں　　آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

بحر کے سینے کو جب طوفان سے لاتی ہوا　　پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں، اور پپیہے کوکتے　　نور میں لپٹے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے
رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر　　سیر کرتے روز ہم بانہیں گلوں میں ڈال کر
کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں　　صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں　　پڑنے لگتیں بحر پر دھندلی سی دو پرچھائیاں
زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم　　سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم
وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لیے　　سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لیے

ورودِ جاناں

بحمد اللہ کہ وہ عشرت کا ساماں لے کے پھر آیا
بہاراں بن کے پھر پلٹا، گلستاں لے کے پھر آیا

مرے خلوت کدے کی وقت آزردہ خموشی میں
نشید و نغمہ و آہنگ والحاں لے کے پھر آیا

رگِ ہستی میں تھا دوران ہے جس کے تبسم سے
رخِ گلگوں میں وہ صبحِ فروزاں لے کے پھر آیا

مری ہستی کو سازِ برگ مستی دے کے پھر چہکا
مری تاریکیوں میں آبِ حیواں لے کے پھر آیا

مرے صحرائے پژمردہ میں بادل بن کے پھر جھوما
مرے دریائے خوابیدہ میں طوفاں لے کے پھر آیا

شبِ اختر شماری کی سرشک آلودہ ظلمت میں
ستارے جس پہ قرباں ہوں وہ افشاں لے کے پھر آیا

تبسم کی گلابی چاندنی مکھڑے پہ چھٹکائے
ترنم کا فسونِ کیف ساماں لے کے پھر آیا

متاعِ بُردَہ، رہزن پہ نہ تھی گو قرض، اس پہ بھی
متاعِ بردۂ عہدِ گل افشاں لے کے پھر آیا

نظامِ محکمِ تقدیر کی تصدیقِ فریادی؛
وجودِ حضرتِ باری پہ برہاں لے کے پھر آیا

مزے کے ساتھ دستک دی پھر انگشت حنائی سے
سرودِ باب و لحنِ سقف و ایواں لے کے پھر آیا

خمِ گم کردۂ ابروئے براں لے کے پھر پلٹا
شبِ مسروقۂ زلفِ پریشاں لے کے پھر آیا

لبوں میں نسترن کی پھر سبک مہکیں لیے دہکا
جلوسِ چودھویں کا ماہِ تاباں لے کے پھر آیا

مری بچھڑی ہوئی ساون کی تانیں دے کے پھر لہکا
مرا روٹھا ہوا ابرِ خراماں لے کے پھر آیا

جبیں پر قشقۂ افسردۂ جنت کو دہکائے ہتھیلی پر حنا پروردہ بستاں لے کے پھر آیا

نفس کی رو میں تجدید کرم کے پھول مہکائے نظر میں تابش ایفائے پیماں لے کے پھر آیا

فسوں کاری کے نغمے لعلِ مے پرور میں چونکائے سیہ مستی کی راتیں زیر مژگاں لے کے پھر آیا

پشیماں تھا نہ جانے کب سے ذوقِ چاکِ دامانی مرا دستِ جنوں، میرا گریباں لے کے پھر آیا

مچلتا، کسمساتا، کشتیوں کی طرح لہراتا جواں انگڑائیوں کا دردِ پنہاں لے کے پھر آیا

شراب آنکھوں میں، سرخی لب پہ، رنگینی تبسم میں مرے افسانۂ پیشیں کا عنواں لے کے پھر آیا

نقاب الٹے، قبا کے بند کھولے، بال بکھرائے جنوں کا حکم، سرشاری کا فرماں لے کے پھر آیا

جراحت بھی مجھے مطلوب تھی اے جوشؔ مرہم بھی مبارک ہو وہ جنسِ درد و درماں لے کے پھر آیا

وداعِ جاناں

وقتِ رخصت کیا کہوں، کیا کیا وہ مہماں لے گیا
ایک عالم کو جلو میں پا بہ جولاں لے گیا!

چشمِ مست و لعلِ شیریں و رخِ گل گوں کے ساتھ
سازِ الواں لے گیا، سوزِ چراغاں لے گیا

موجِ ناز و موجِ ساز و موجِ مے کے ساتھ ساتھ
جوئے در افشاں و بوئے سنبلستاں لے گیا

سو گئی قندیل در، سُن ہو گیا پائے ستوں
حسنِ سقف و بام، نازِ طاق و ایواں لے گیا

سرخوشی کی موج سے درہائے تاباں چن لیے
زندگی کی روح سے ابرِ بہاراں لے گیا

حسن سے محروم کر کے دیدۂ نمناک کو
عشق کی محراب سے شمعِ فروزاں لے گیا

عین پچھلی رات کو وہ کار فرمائے سحر
شامِ ظلمت دے گیا، صبحِ درخشاں لے گیا

رات تھی جس کے خنک انوار سے تاروں بھری
اپنے ماتھے کی وہ گوہر بار افشاں لے گیا

جس تمنا میں گمک تھی، گونج تھی، جھنکار تھی
اس تمنا سے خروش و جوشِ طوفاں لے گیا

ناز سے منہ موڑ کر، باہر سے چلمن چھوڑ کر
رقصِ خوشبو لے گیا، رنگِ شبستاں لے گیا

کھول کر بابِ تبسم، باندھ کر بندِ قبا
میرا دامن لے گیا، میرا گریباں لے گیا

زندگی کی روشنی کو، راگنی کو، رقص کو
ساتھ اپنے کھینچتا افتاں و خیزاں لے گیا

جذب فرما کر سلامِ رخصتی کے لوچ میں
جذبۂ رقصانِ دہیجانِ غزل خواں لے گیا

نرگسِ گل رنگ کے ڈوروں میں بھر کر ناز سے — سرخیٔ مے ہی نہیں، خونِ رگِ جاں لے گیا

خم بہ خم گیسو کی شامِ فصلِ گل کی چھاؤں میں — نیم باز آنکھوں کی صبحِ شبنمستاں لے گیا

ولولوں کی نو بہ نو قوسیں، امنگوں کے ہلال — توڑ کر زیرِ خمِ تسلیم برّاں لے گیا

سرخیٔ مینا اڑا کر، انکھڑیوں میں کھینچ لی — لرزشِ صہبا چرا کر، زیرِ مژگاں لے گیا

صرف گیتی ہی کے ساز و برگ پر کیا منحصر — میرے گردوں سے بھی جنسِ لعل و مرجاں لے گیا

کھینچ کر دوشِ فضا سے روند ڈالی چاندنی — نوچ کر عقدِ ثریا دشمنِ جاں لے گیا

جیب میں بھر کر ستارے، منہ پہ مل کر کہکشاں — باندھ کر جوڑے میں نورِ ماہِ تاباں لے گیا

جاتے جاتے اف کچھ ایسی مدبھری انگڑائی لی — ایک طوفاں دے گیا اور ایک طوفاں لے گیا

سر پہ چادر، پاؤں میں لغزش، نفس میں احتیاط — خود کو مانندِ چراغِ زیرِ داماں لے گیا

جوشؔ کس سے جا کے یہ کہیے کہ اک سروِ رواں — لوٹ کر میرا گلستاں کا گلستاں لے گیا

رنگ و بو

رنگ و بو

البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیور بزم سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی ؟
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مدِ نظر ہیں کتنی رعائتیں چشمِ خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے
شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلّو سکھا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں یہ کس کی آواز آ رہی ہے

یومِ بہار

اے ہم نشیں! وہ جوشِ مئے ارغواں ہے آج
صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج!

ہر غنچہ پر رقص کناں ہے بہ طرحِ نو!
چشم و چراغ سلسلۂ قدسیاں ہے آج

جس پر نثار موجۂ تسنیم و سلسبیل
بکھری ہوئی وہ کاکلِ عنبر فشاں ہے آج

اللہ رے سیلِ نغمہ و طوفانِ رنگ و بو
موجِ ہوا میں جنبشِ نبضِ جواں ہے آج

شکرِ خدا کہ طرۂ طرفِ کلاہِ دوست
مشعل فروزِ مجلسِ روحانیاں ہے آج

پھر چہرۂ بشر پہ ہے رنگِ الوہیت
پھر فرشِ خاک پر سرِ کرّ و بیاں ہے آج

اوجِ فلک پہ موجۂ ابرِ سبک خرام
صحنِ چمن میں جلوۂ سرو رواں ہے آج

وہ دخترِ رز کہ تھی خمِ رنگیں میں معتکف
صد شکر صدرِ انجمنِ مے کشاں ہے آج

اف ری شمیم کاکلِ شب رنگ و بوئے عود
دوشِ صبا پہ دولتِ باغِ جناں ہے آج

رندوں کے ساتھ روحِ دو عالم ہے رقص میں
یوم طوافِ کعبۂ رطلِ گراں ہے آج

ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہِ ناز
"عین الیقیں" بہشت کا وہم و گماں ہے آج

زیرِ نگیں زمین ہے قبضے میں آسمان
آفاق پر حکومتِ پیرِ مغاں ہے آج

ہر خشک و تر میں گونج رہی ہیں حکایتیں
ہر ذرۂ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج

رہ رہ کے اُڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

اے جوشؔ زلزلے میں ہے قصرِ تعینات
دل ماورائے قیدِ زمان و مکاں ہے آج

برسات کی چاندنی

چرخ پر برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے جابجا
چاندنی، تالاب، سناٹا، پپیہے کی صدا؛

دشت پر چھائے ہوئے ذوقِ جنوں کے ولولے
چاند میں معصوم بچے کے تبسم کی ادا؛

فصلِ سرما میں سحر کو غسل کر چکنے کے بعد
رنگ ہو جیسے کسی معشوق کا نکھرا ہوا

سینۂ امواج میں سیال چاندی کی تڑپ
طاقِ گل میں قطرۂ شبنم کا چھوٹا سا دیا

نرم شاخوں کی لچک، سرشار ساحل کا سکوت
دشت کی خوشبو، فضا کی تازگی، ٹھنڈی ہوا

جانستاں کلیوں کے عقدے، نور سے سلجھے ہوئے
دلِ ربا میداں کا دامن اوس میں ڈوبا ہوا

موجزن ہے اتصالِ ماہ و جوئے تند میں
وہ طرب کا دورِ کرب افزا، کہ تھا بھولا ہوا

موسمِ باراں کی رو میں چاند شفاف و رقیق
مینہ کے چھینٹوں کے اثر سے آسماں نکھلا ہوا

کانپتی لہروں سے اٹھتے ہیں نمو کے زمزمے
جھومتے پودوں سے آتی ہے جوانی کی صدا

لرزشِ صہبا میں جھلکے جس طرح نشے کی روح
چاند ہے اس طرح قلبِ آب میں ڈوبا ہوا

گھٹا

اٹھی گھٹا، وہ رنگ و بو کا کارواں لیے ہوئے
جلو میں کائنات کی جوانیاں لیے ہوئے

لیے ہوئے پیامِ جاں ہر ایک رس کی بوند میں
ہر ایک رس کی بوند میں پیامِ جاں لیے ہوئے

لیے ہوئے ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں
ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں لیے ہوئے

دھواں دھواں لیے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی
بلندیوں پہ چرخ کی دھواں دھواں لیے ہوئے

زمینِ تشنہ کام کی جماہیوں کے سامنے
شراب لالہ رنگ کی گلابیاں لیے ہوئے

وفورِ سوز و ساز میں ہجوم پیچ و تاب سے
رقیق و نرم دامنوں میں بجلیاں لیے ہوئے

ہر ایک سو رواں دواں، کبھی یہاں کبھی وہاں!
بتانِ شوخ و شنگ کی سی شوخیاں لیے ہوئے

صدائے برق و رعد میں، ہوائے تند و تیز میں
نزاعِ حسن و ہوش کی کہانیاں لیے ہوئے

ہوا میں اینڈتی ہوئی فضا میں جھومتی ہوئی
تحمل و شکیب کی تباہیاں لیے ہوئے

بہشتِ حسن و عشق کو، جہانِ رقص و کیف کو
فضائے آب و رنگ میں کشاں کشاں لیے ہوئے

حریمِ کیف و سرخوشی میں، پردہ ہائے رنگ میں
سبو بدوش مغبچوں کی مستیاں لیے ہوئے

ادا و ناز و دلبری کی رنگ ریز چھاؤں میں
نئی نئی جوانیوں کی جھلکیاں لیے ہوئے

لیے ہوئے ہواؤں پر سیاہ و سرخ کشتیاں
ہوائے تند کشتیوں کے بادباں لیے ہوئے

لیے ہوئے بلندیوں پہ ولولے حیات کے
حیات بخش ولولے بلندیاں لیے ہوئے

سیاہیوں کے سلسلے میں، تیرگی کی موج میں
جنوں فروش کاکلوں کی داستاں لیے ہوئے

کدھر ہے جوش! بدلیاں رواں ہیں سوئے میکدہ
سیاہیوں کے حاشیے پہ سرخیاں لیے ہوئے

شام کا رومان

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں
مجھے ہر ایک پتی نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

فضائے نرم پر جس وقت چھا جاتا ہے سناٹا
مجھے جنبش میں ذروں کی زباں معلوم ہوتی ہے

سنکتی ہے مزے سے جب گھنے جنگل کے سائے میں
ہوائے سرد میری ہم زباں معلوم ہوتی ہے

بلند و پست و آب و رنگ جب کچھ بھی نہیں رہتا
یہ دنیا صرف اک وہم و گماں معلوم ہوتی ہے

ٹپک پڑتا ہے جب خورشید آنسو بن کے گردوں سے
لبِ جاں پر صدائے الاماں معلوم ہوتی ہے

دلِ وادی سے اٹھتا ہے دھواں جس وقت ہلکا سا
پہاڑوں کی بلندی سرگراں معلوم ہوتی ہے

چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے دامن میں
بشر سے روحِ عالم بدگماں معلوم ہوتی ہے

جھلک اٹھتا ہے جب پہلا ستارہ بامِ گردوں پر
کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے

فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اداسی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

شفق کو دیکھتے ہی وہ محبت جس کو جُگ بیتا
مرے دکھتے ہوئے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

اندھیرے میں لبِ ساحل جو پودے کھڑکھڑاتے ہیں
مجھے گیرائی فصلِ خزاں معلوم ہوتی ہے

زمین و آسمان جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں رائیگاں معلوم ہوتی ہے

شفق کے ہر نفس اڑتے ہوئے اوراقِ زریں میں
مجھے بے تابیٔ عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

دیا کچھ فاصلے پر ٹمٹما اٹھتا ہے جب بن میں
سیاہی روشنی کی رازداں معلوم ہوتی ہے

رتیلی ڈھال پر انگڑائی لیتا ہے اک افسانہ
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لُو کا زور

آگ کی رَو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب

شور، ہل چل، غلغلہ، ہیجان، لُو، گرمی، بخار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار

مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بُو، مرچوں کی دھانس
خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس

دھوپ کی شدّت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رَو
کملیوں پر سرخ چاول، ٹماٹر کے ٹکڑوں پہ جو

گرم ذروں کے شدائد، جھگڑوں کی سختیاں
جھگڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں

ماؤں کے کاندھوں پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے

بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے
ہر نفس اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرات سے

مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھنتے ہوئے

میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی

لو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی

یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
بے مروت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی

آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم

ہر روش پر چڑچڑاپن، ہر صدا میں بے رخی
ہر جگر بھنتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی

سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

رباعیات

رباعیات

حقائق

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن کا نیا نکالا ہم نے!
ذرّات کو چھوڑ کر حریفوں کے لیے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

نومیدئ نظارۂ انوار بھی جہل
امیدِ شہود و شوقِ دیدار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تک ہے سوال
"انکار" بھی جہل ہے اور "اقرار" بھی جہل

آزادئ فکر و درسِ حکمت ہے گناہ
دانا کے لیے نہیں کوئی جائے پناہ
اس اژدرِ تہذیب کے فرزندِ رشید
یہ "مذہب" و "قانون" عیاذاً باللہ!

دنیا میں ہیں بے شمار آنے والے
آتے ہی رہیں گے روز جانے والے
عرفانِ حیات ہو مبارک تجھ کو!
اے شدّتِ غم پہ مسکرانے والے

کیا جانیے چہرہ زرد ہوتا کیوں ہے
دل رنج و الم سے سرد ہوتا کیوں ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم
کانٹا چبھنے سے درد ہوتا کیوں ہے

خنجر ہے کوئی، تو تیغِ عریاں کوئی
صرصر ہے کوئی تو بادِ طوفاں کوئی
"انساں" کہاں ہے؟ کس کُرّے میں گم ہے
یاں تو کوئی "ہندو" ہے "مسلماں" کوئی

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب
اُڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں، اک تو مائل بہ زمیں
اور ایک کا رخ ہے آسماں کی جانب

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا!
آگے کئی صدیوں سے ہے ترانہ اپنا!
قدرت سے ملا ہے مجکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا فسانہ اپنا!

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب!
سو بار جہنم میں جلانا یارب!
معشوق کہیں "آپ ہمارے ہیں بزرگ"
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب!

قدموں پہ مرے عرشِ معلیٰ بھی سہی
خورشید کی انجمن میں ذرہ بھی سہی
حوریں حاضر ہوئی ہیں مجرے کے لیے
اچھا حاضر کرو، یہ تقویٰ بھی سہی

اکثر انعام قہر بن جاتا ہے
یہ بحرِ کثیف نہر بن جاتا ہے
وہ علم کہ اکسیر ہے انساں کے لیے
گر ہضم نہ ہو تو زہر بن جاتا ہے

ذہنی مردوں سے دل لگاؤں کیونکر
چلتی لاشوں کے پاس جاؤں کیونکر
مجرم ہو تو لاکھ بار کرلوں برداشت
احمق کا مگر بار اٹھاؤں کیونکر؟

اک فتنہ ہے ناقصوں میں کامل ہونا
اک قہر ہے وابستۂ منزل ہونا
تاریخ کے اوراق جو الٹے تو کھُلا
اک جرم ہے احمقوں میں عاقل ہونا

حُسن و عشق

افسوس یہ حسن، یہ بدحواسی تیری
دل ہی نہیں روح بھی ہے پیاسی تیری
ہنستی ہے تو منہ اترنے لگتا ہے ترا
کس درجہ مکمل ہے اداسی تیری

پابندِ ہراس کیوں ہے؟ تیرے قرباں
آشفتہ حواس کیوں ہے؟ تیرے قرباں
تجھ پر تو ہے انبساطِ عالم کا مدار
تو اتنی اداس کیوں ہے؟ تیرے قرباں

ہے صبح افق سے جگمگانے والی
وعدے پہ ہے ان کے مسکرانے والی
جا پچھلے پہر کے چاند! ان سے کہہ دے
اب رات ہے دو گھڑی میں جانے والی

اے رونقِ لالہ زار، واپس آجا　　اے دولتِ برگ و بار واپس آجا
ایسے میں کہ نو بہار ہے خلد بدوش　　اے نازشِ نو بہار واپس آجا

ٹپکاتی ہوئی گھٹا جب آنسو آئی　　فرقت کا جگاتی ہوئی جادو آئی؛
ہلکا ہلکا دھواں کلیجے سے اٹھا　　سوندھی سوندھی زمیں سے خوشبو آئی

ناگن بن کر مجھے نہ ڈسنا بادل!　　باراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل!
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے　　اس دیس میں اب کی نہ برسنا بادل

چونکا ہے کوئی نگار، الٰہی توبہ!　　رس میں ڈوبا خمار، الٰہی توبہ
سکتے میں ہیں بھیرویں کی تانیں گویا　　ہونٹوں کا خفیف ابھار، الٰہی توبہ

جانے والے قمر کو روکے کوئی　　شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی　　روکے، روکے، سحر کو روکے کوئی

کیا آج تعارف میں لجایا کوئی　　کیا جانیے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
میں نے جو کہا "جوش مجھے کہتے ہیں"　　آنکھوں کو جھکا کے مسکرایا کوئی

اے پھول، صبا ہمیشہ مہکائے تجھے
اے چاند کبھی گھٹا نہ سنولائے تجھے
اس نیند بھرے لوچ سے للٰلہ نہ چل
ڈرتا ہوں کہیں نظر نہ لگ جائے تجھے

جلتے دل کو ٹٹول، دھیرے دھیرے
اگنی مندر کو کھول دھیرے دھیرے
برہا میں برس رہی ہے پاپی برکھا
کلموئی کوئلیا بول دھیرے دھیرے

تیار ہوں آپ، کم نگاہی کے لیے !
آمادہ ہوں اور میری تباہی کے لیے!!
میں نے حضرت سے کل جو کی تھی نیکی
آج آیا ہوں اس کی عذرخواہی کے لیے

خمریات

ہشیار کہ آفتاب ہونا ہے تجھے
پیغمبرِ انقلاب ہونا ہے تجھے
ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا
بیدار کہ خود شراب ہونا ہے تجھے

کیا شیخ ملے گا گل فشانی کر کے ؟
کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے ؟
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انھیں!
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے!

جھومی تاریک رات میرے دل میں
بدمست ہوئی حیات میرے دل میں
ساقی نے سبو دے کے اٹھایا جو رباب
گم ہو گئی کائنات میرے دل میں!

ممنوع شجر سے لطفِ پیہم لینے
عصیاں کی گھنی چھاؤں میں پھر دم لینے
آوازہ دو کا شمیر آپہنچا جو تش
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

یہ رات گئے، عین طرب کے ہنگام؛
پر تو یہ پڑا پشت سے کس کا سرِ جام
"یہ کون ہے؟" "جبریل ہوں" "کیوں آئے ہو؟"
"سرکار! فلک کے نام کوئی پیغام؟"

اے خواب بتا یہی ہے باغِ رضواں
حوروں کا کہیں پتہ نہ غلماں کا نشاں
اک کنج میں خاموش و ملول و تنہا
بے چارے ٹہل رہے ہیں اللہ میاں

اب مطربِ وقت کا ترانہ ہے کچھ اور
بدلی ہوئی دنیا کا فسانہ ہے کچھ اور
ہاں نازکیٔ طبع کی روکے ہوئے باگ
شبیر حسن خاں یہ زمانہ ہے کچھ اور

پیرانِ سالوس

ہم دیکھ کے مہوشوں کو کیا کہتے ہیں؟ اتنا ہی کہ بس "صلِّ علیٰ" کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ زر بہ ایں ریشِ دراز موقع ہو تو ہر بت کو "خدا" کہتے ہیں

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے انساں کو بہر طور دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنہ جو احمق اُن کو بے روح نمازوں میں لگا دیتا ہے

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری بے چارے کی اک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیّل میں بڑھاپا بیتا جنّت کی دعاؤں میں جوانی گزری

حسین اور انقلاب

ہمراز یہ فسانۂ آہ و فغاں نہ پوچھ　　دو دن کی زندگی کا غم این و آں نہ پوچھ
(۱)
کیا کیا حیاتِ ارض کی ہیں تلخیاں نہ پوچھ　　کس درجہ ہولناک ہے یہ داستاں نہ پوچھ

تفصیل سے کہوں تو فلک کانپنے لگے

دوزخ بھی فرطِ شرم سے منہ ڈھانپنے لگے

دنیا کی ہر خوشی ہے غم و درد سے دوچار　　ہر قہقہے کی گونج میں ہے چشمِ اشکبار
(۲)
کیا خار و خس کہ وہ تو ہیں معتوب روزگار　　نسرین و نسترن میں بھی پنہاں ہے نوکِ خار

نغمے ہیں جنبشِ دلِ مضطر لیے ہوئے

گل برگ تک ہے بُرّشِ خنجر لیے ہوئے

یارانِ سرفروش و نگارانِ مہ جبیں　　آبِ نشاط و لعلِ لب و زلفِ عنبریں
(۳)
کوئے مغان و بوئے گل و رقصِ دل نشیں　　زورِ وزن و ذکاوت و ذہن و زرو زمیں

جو شے بھی ہے وہ درد کا پہلو لیے ہوئے

ہر گوہرِ نشاط ہے آنسو لیے ہوئے

بیگانۂ حدود ہے انساں کی آرزو
پیچیدہ ہر نظر میں ہے اک تازہ جستجو
تھمتی نہیں کہیں بھی تمنائے برق خو
ساقی کا وہ کرم ہے کہ بھرتا نہیں سبو

(۴)

ارماں کی شاہ راہ میں منزل نہیں کوئی
اس بحرِ بے کنار کا ساحل نہیں کوئی

اس لیلئ حیات کی اللہ ری دار و گیر
ہر لوچ اک کمان ہے ہر ناز اک تیر
اِس کے کرم میں بھی وہ حرارت ہے ہم صفیر
جس کے مقابلے میں جہنم ہے زمہریر

(۵)

الجھے جو اس کے گیسوئے پیچاں کے جال میں
لگ جائے آگ دامنِ قطبِ شمال میں

امراض سے کسی کا بڑھاپا ہے اک وبال
آلام سے کسی کی جوانی ہے پائمال
اِس کو ہے خوفِ ننگ، اُسے نام کا خیال
روزی سے کوئی تنگ کوئی عشق سے نڈھال

(۶)

ہر سانس ہے نوید عذابِ عظیم کی
گھبرا کے دو دہائی خدائے رحیم کی

اس خوں چکاں حیات کے آلام کیا کہوں
قدرت نہیں فسانۂ ایام کیا کہوں
دارائے کائنات کے انعام کیا کہوں
یہ داستانِ مرحمتِ عام کیا کہوں

(۷)

کہہ دوں تو دل سے خون کا چشمہ ابل پڑے
اور چپ رہوں تو منہ سے کلیجہ نکل پڑے

(۸)

نوعِ بشر پہ ہے جو عقوبت نہ پوچھیے　　سفاک زندگی کی شقاوت نہ پوچھیے

جورِ حیات و جبرِ مشیت نہ پوچھیے　　کتنا رقیق ہے دلِ قدرت نہ پوچھیے

سو سال اگر خزاں کے تو دو دن بہار کے

قرباں ہجومِ رحمتِ پروردگار کے

(۹)

یوں تو غمِ معاش کا سوزِ نہاں ہے اور　　تکلیفِ جاں گدازئ عشقِ بتاں ہے اور

لب تشنگئ شیب و عذابِ خزاں ہے اور　　اعلانِ امرِ حق کی مگر داستاں ہے اور

"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود

چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود" (صائب)

(۱۰)

ہاں اس بلا سے کوئی بلا بھی بڑی نہیں　　کیا اس کو علم جس پہ یہ بپتا پڑی نہیں

کشتوں کی اس کے لاش بھی اکثر گڑی نہیں　　اعلانِ امرِ حق سے کوئی شے کڑی نہیں

بے جرم خود کو جرم میں جو راندھ لے وہ آئے

اس راہ میں جو سر سے کفن باندھ لے وہ آئے

(۱۱)

تکلیفِ رشد و کاہشِ تبلیغ الاماں　　یہ دائرہ ہے دائرۂ مرگِ ناگہاں

پیہم یہاں سروں پہ کڑکتی ہیں بجلیاں　　بارِ الم سے بولنے لگتے ہیں استخواں

ہر گام پہ حیات کے چہرے کو فق کرے

مرنا جو چاہتا ہو وہ اعلانِ حق کرے

(۱۲)

کیسے کوئی عزیز روایات چھوڑ دے — کچھ کھیل ہے کہ کہنہ حکایات چھوڑ دے
گھٹی میں تھے جو حل وہ خیالات چھوڑ دے — ماں کا مزاج، باپ کے عادات چھوڑ دے
کس جی سے کوئی رشتۂ اوہام توڑ دے
ورثے میں جو ملے ہیں وہ اصنام توڑ دے

(۱۳)

اوہام کا رباب، قدامت کا ارغنوں — فرسودگی کا سحر، روایات کا فسوں
اقوال کا مراق، حکایات کا جنوں — رسم و رواج و صحبت و میراث و نسل و خوں
افسوس یہ وہ حلقۂ دامِ خیال ہے
جس سے بڑے بڑوں کا نکلنا محال ہے

(۱۴)

اس بزمِ ساحری میں جہالت کا ذکر کیا — خود علم کے حواس بھی رہتے نہیں بجا
اوہام جب دلوں میں بجاتے ہیں دائرا — عقلوں کو سوجھتا ہی نہیں رقص کے سوا
تاریخ جھومتی ہے فسانوں کے غول میں
بوڑھے بھی ناچتے ہیں جوانوں کے غول میں

(۱۵)

جس دائرے میں قصرِ قدامت کا ہو طواف — جدت کے جرم کو کوئی کرتا نہ ہو معاف
بگڑے ہوئے رسوم کا ذہنوں پہ ہو غلاف — آواز کون اٹھائے وہاں جہل کے خلاف
آواز اٹھائے موت کی جو آرزو کرے
ورنہ مجال ہے کہ یہاں گفتگو کرے

۱۶

ہوتا ہے جو سماج میں جویائے انقلاب ملتا ہے اس کو مرتد و زندیق کا خطاب
پہلے تو اس کو آنکھ دکھاتے ہیں شیخ و شاب اس پر بھی وہ نہ چپ ہو تو پھر قوم کا عتاب
بڑھتا ہے ظلم و جور کے تیور لیے ہوئے
تشنیع و طعن و دشنہ و خنجر لیے ہوئے

۱۷

اٹھتا ہے غلغلہ کہ یہ زندیقِ نامراد؛ کج فکر و کج نگاہ و کج اخلاق و کج نہاد
پھیلا رہا ہے عالمِ اخلاق میں فساد اے صاحبانِ جذبۂ دیرینۂ جہاد
ہاں جلد اٹھو تباہیٔ باطل کے واسطے
جنّت ہے ایسے شخص کے قاتل کے واسطے

۱۸

اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا رعب و شکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہانِ کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا قرنا و طبل و ناوک و رایت کا سامنا
لاکھوں میں ہے وہ ایک کروروں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

۱۹

اور بالخصوص بند ہو جب ہر درِ نجات حق تشنہ لب ہو دشت میں، باطل لبِ فرات
دستِ اجل میں ہو زن و فرزند تک کی ذات حائل ہو مرگ و زیست میں لے دے کے ایک رات
یہ وہ گھڑی ہے کانپ اٹھے شیرِ نر کا دل
اس تہلکے کو چاہیئے فوق البشر کا دل

(۲۰)

وہ کربلا کی رات وہ ظلمت ڈراؤنی — وہ مرگ بے پناہ کے سائے میں زندگی
خیموں کے گرد و پیش وہ پر ہول خامشی — خاموشیوں میں دور وہ چاپ موت کی
تھی پشت وقت بار الم سے جھکی ہوئی
ارض و سما کی سانس تھی گویا رکی ہوئی

(۲۱)

وہ اہل حق کی تشنہ دہاں مختصر سپاہ — باطل کا وہ ہجوم کہ اللہ کی پناہ
وہ ظلمتوں کے دام میں زہرا کے مہر و ماہ — تارے وہ فرط غم سے جھکائے ہوئے نگاہ
وہ دل بجھے ہوئے وہ ہوائیں تھمی ہوئی
وہ اک بہن کی بھائی پہ نظریں جمی ہوئی

(۲۲)

لبریز زہر جور سے وہ دشت کا ایاغ — دکھتے ہوئے وہ دل وہ تپکتے ہوئے دماغ
آنکھوں کی پتلیوں سے عیاں وہ دلوں کے داغ — پر ہول ظلمتوں میں وہ سہمے ہوئے چراغ
بکھرے ہوئے ہوا میں وہ گیسو رسولؐ کے
تاروں کی روشنی میں وہ آنسو بتولؑ کے

(۲۳)

وہ رات وہ فرات وہ موجوں کا خلفشار — عابد کی کروٹوں پہ وہ بیچارگی کا بار
وہ زلزلوں کی زد پہ خواتین کا وقار — اصغر کا پیچ و تاب وہ جھولے میں بار بار
اصغر میں پیچ و تاب نہ تھا اضطراب کا
وہ دل دھڑک رہا تھا رسالت مآب کا

(۲۴)

وہ رات جب امام کی گونجی تھی یہ صدا — اے دوستانِ صادق و یارانِ باصفا
باقی نہیں رہا ہے کوئی اور مرحلا — اب سامنا ہے موت کا اور صرف موت کا
لگنے ہی پہ بلائیں ہیں اب تحت و فوق سے
جانا جو چاہتا ہے چلا جائے شوق سے

(۲۵)

اور سنتے ہی یہ بات بصد کرب و اضطراب — شبیر کو دیا تھا یہ انصار نے جواب
دیکھیں جو ہم یہ خواب بھی اے ابن بوتراب — واللہ فرطِ شرم سے ہو جائیں آب آب
قرباں نہ ہو جو آپ سے والا صفات پر
لعنت اس امن و عیش پہ تف اُس حیات پر

(۲۶)

کیا آپ کا خیال ہے یہ شاہِ ذی حشم — ہم ہیں اسیرِ سود و زیاں صیدِ کیف و کم
خود دیکھ لیجیے گا کہ گاڑیں گے جب قدم — ہٹنا تو کیا ہلیں گے نہ دشتِ وغا سے ہم
پتلے ہیں ہم حدید کے، پیکر ہیں سنگ کے
انساں نہیں پہاڑ ہیں میدانِ جنگ کے

(۲۷)

ہاں ہاں وہ رات وحشت و بیم و رجا کی رات — افسونِ جاں کنی و طلسمِ قضا کی رات
لب تشنگانِ ذریتِ مصطفٰی کی رات — جو حشر سے عظیم تھی وہ کربلا کی رات
شبیر نے حیات کا عنواں بنا دیا
اس رات کو بھی مہرِ درخشاں بنا دیا

۲۸

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم — دشتِ ثبات و عزم ہے دشتِ بلا و غم
منبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم — اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے
جس سورما کا اسمِ گرامی حسین ہے

۲۹

جو صاحبِ مزاجِ نبوت تھا وہ حسین — جو وارثِ ضمیرِ رسالت تھا وہ حسین
جو خلوتیِ شاہدِ قدرت تھا وہ حسین — جس کا وجود فخرِ مشیت تھا وہ حسین
سانچے میں ڈھالنے کے لیے کائنات کو
جو تولتا تھا نوکِ مژہ پر حیات کو

۳۰

جو اک نشانِ تشنہ دہانی تھا وہ حسین — گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا وہ حسین
جو خلد کا امیرِ جوانی تھا وہ حسین — جو اک سنِ جدید کا بانی تھا وہ حسین
جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لیے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لیے ہوئے

۳۱

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسین — خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسین
اک دینِ تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسین — جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسین
جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا

ہاں اب بھی جو منارۂ عظمت ہے وہ حسین　　جس کی نگاہ مرگِ حکومت ہے وہ حسین
(۳۲)
اب بھی جو محوِ درسِ بغاوت ہے وہ حسین[1]　　آدم کی جو دلیلِ شرافت ہے وہ حسین

واحد جو اک نمونہ ہے ذبحِ عظیم کا
شاہد ہے جو خدا کے مذاقِ سلیم کا

ہاں وہ حسین جس کا ابد آشنا ثبات　　کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
(۳۳)
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات　　اک کارساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

جس کا وجود عدل و مساوات کی مراد　　جو کردگارِ امن تھا پیغمبرِ جہاد
(۳۴)
تحویلِ زندگی میں پئے رفعِ ہر فساد　　قدرت کی اک امانتِ زریں ہے جس کی ذات

سوزاں ہے قلبِ خاک جو خونِ مبین سے
اک لَو نکل رہی ہے ابھی تک زمین سے

عزت پہ جس نے سر کو فدا کر کے دم لیا　　صدق و منافقت کو جدا کر کے دم لیا
(۳۵)
حق کو ابد کا تاج عطا کر کے دم لیا　　جس نے یزیدیت کو فنا کر کے دم لیا

فتنوں کو جس پہ ناز تھا وہ دل بجھا دیا
جس نے چراغِ دولتِ باطل بجھا دیا

---

[1] حکومتِ باطل سے بغاوت کرنا بہت بڑی عبادت ہے۔

۳۶

عالم میں ہو چکا ہے مسلسل یہ تجربہ — قوت ہی زندگی کی رہی ہے گرہ کشا
سر ضعف کا ہمیشہ رہا ہے جھکا ہوا — ناطاقتی کی موت ہے طاقت کا سامنا
طاقت سی شے مگر خجل و بدنصیب تھی
ناطاقتی حسین کی کتنی عجیب تھی

۳۷

طاقت سی شے کو خاک میں جس نے ملا دیا — تختہ الٹ کے قصرِ حکومت کو ڈھا دیا
جس نے ہوا پہ رعبِ امارت اڑا دیا — ٹھوکر سے جس نے افسرِ شاہی گرا دیا
اس طرح جس سے ظلم سیہ فام ہو گیا
لفظِ یزید داخلِ دشنام ہو گیا

۳۸

پانی سے تین روز ہوئے جس کے لب نہ تر — تیغ و تبر کو سونپ دیا جس نے گھر کا گھر
جو مر گیا ضمیر کی عزت کے نام پر — ذلت کے آستاں پہ جھکایا مگر نہ سر
لی جس نے سانس رشتۂ شاہی کو توڑ کر
جس نے کلائی موت کی رکھ دی مروڑ کر

۳۹

جس کی جبیں پہ کج ہے خود اپنے لہو کا تاج — جو مرگ و زندگی کا ہے اک طرفہ امتزاج
سر دے دیا مگر نہ دیا ظلم کو خراج — جس کے لہو نے رکھ لی تمام انبیا کی لاج
سنتا نہ کوئی دہر میں صدق و صفا کی بات
جس مردِ سرفروش نے رکھ لی خدا کی بات

ہر چند اہلِ جور نے چاہا یہ بارہا   ہو جائے محو یادِ شہیدانِ کربلا
(۴۰) باقی رہے نہ نام زمیں پہ حسین کا   لیکن کسی کا زور عزیزو نہ چل سکا
عباس نامور کے لہو سے دھلا ہوا
اب بھی حسینیت کا عَلم ہے کھلا ہوا

یہ صبحِ انقلاب کی جو آج کل ہے ضَو   یہ جو مچل رہی ہے صبا پھٹ رہی ہے پَو
(۴۱) یہ جو چراغ ظلم کی تھرا رہی ہے لَو   در پردہ یہ حسین کے انفاس کی ہے رَو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اُسی جری کی ہے آواز دوستو

جس کا ہجوم درد و الم سے یہ حال تھا   سینہ تھا پاش پاش جگر پائمال تھا
(۴۲) رخ پہ تھا تشنگی کا دھواں، دل نڈھال تھا   اس کرب میں بھی جس کو فقط یہ خیال تھا
آتش برس رہی ہے تو برسے خیام پر
آنے نہ پائے آنچ مگر حق کے نام پر

ہر چند ایک شاخ چمن میں ہری نہ تھی   ماتھا عرق عرق تھا، لبوں پہ تری نہ تھی
(۴۳) باطل کی ان بلاؤں پہ بھی چاکری نہ تھی   یہ داوری تھی اصل میں پیغمبری نہ تھی
رنگ اڑ گیا حکومتِ بدعت شعار کا
عزمِ حسین عزم تھا پروردگار کا

تھی جس کے دوشِ پاک پہ اہلِ ولا کی لاش — انصارِ سرفروش کی لاش، اقربا کی لاش
(۴۴)
عباس سے مجاہدِ تیغ آزما کی لاش — قاسم سے شاہزادۂ گلگوں قبا کی لاش

پھر بھی یہ دھن تھی صبر کی زلفوں سے بل نہ جائے
اس خوف سے کہ حق کا جنازہ نکل نہ جائے

نزار و نزار و تشنہ و مجروح و ناتواں — تنہا کھڑا ہوا تھا جو لاکھوں کے درمیاں
(۴۵)
گھیرے تھے جس کو تیر و تبر ناوک و سناں — اور سو رہا تھا موت کے بستر پہ کارواں

اتنا نہ تھا کہ حقِ رفاقت سے کام لے
گرنے لگیں اگر تو کوئی بڑھ کے تھام لے

ہاں وہ حسین خستہ و مجروح و ناتواں — ساکت کھڑا ہوا تھا جو لاشوں کے درمیاں
(۴۶)
سنتا رہا سکون سے جو پیرِ نیم جاں — اکبر سے ماہ رو کی جوانی کی ہچکیاں

ہے ہے کی آ رہی تھی صدا کائنات سے
پھر بھی قدم ہٹائے نہ راہِ ثبات سے

ہاں اے حسین تشنہ و رنجور السلام — اے میہمانِ عرصۂ بے نور السلام
(۴۷)
اے شمعِ حلقۂ شبِ عاشور السلام — اے سینۂ حیات کے ناسور السلام

اے ساحلِ فرات کے پیاسے ترے نثار
اے آخری نبی کے نواسے ترے نثار

ہاں اے حسین بے کس و ناچار السلام — اے کشتگانِ عشق کے سردار السلام
(۴۸)
اے سوگوارِ یاور و انصار السلام — اے کاروانِ مردہ کے سالار السلام

افسوس اے وطن سے نکالے ہوئے حسین
اے فاطمہ کی گود کے پالے ہوئے حسین

تو اور تیرے حلق پہ تلوار ہائے ہائے — زنجیر اور عابدِ بیمار ہائے ہائے
(۴۹)
زینب کا سر کھلے سرِ بازار ہائے ہائے — سر تیرا اور یزید کا دربار ہائے ہائے

انسان اس طرح اتر آئے عناد پر
لعنت خدا کی حشر تک ابنِ زیاد پر

تجھ سا شہید کون ہے عالم میں اے حسین — تو ہے ہر ایک دیدۂ پرنم میں اے حسین
(۵۰)
زہاد ہی نہیں ہیں ترے غم میں اے حسین — ہم رند بھی ہیں حلقۂ ماتم میں اے حسین

آزاد جو خیال میں ہیں اور کلام میں
وہ بھی اسیر ہیں تری زلفوں کے دام میں

یوں تو درونِ سینۂ تاریخِ روزگار — دولت ہے بے حساب جواہر ہیں بیشمار
(۵۱)
لیکن ترا وجود ہے اے مردِ حق شعار — عزمِ بشر کی واحد و بے مثل یادگار

تکتا ہے تجھ کو وقتِ جہاں سوز دور سے
تو ہے بلند ضربِ سنین و شہور سے

اس باغِ دہر میں پئے تفسیرِ رنگ و بو
یوں تو ہے ہر روش پہ اک انبارِ گفتگو
(۵۲)
لیکن برائے گوشِ حکیمانِ رازجو
عالم میں صرف اک سخنِ گفتنی ہے تو
مردانگی کے طور کا تنہا کلیم ہے
تو سینۂ حیات کا قلبِ سلیم ہے

اے رہبرِ خجستہ واے ہادیٔ غیور
تو حافظے کا ناز ہے، تاریخ کا غرور
(۵۳)
اب بھی ترے نشانِ قدم سے ہے وہ سرور
لوحِ جبینِ وقت پہ غلطاں ہے موجِ نور
تو ہے وہ مہر دفترِ عزم و ثبات پر
اب تک چمک رہی ہے جو پشتِ حیات پر

ہاں اے حسین ابنِ علی رہبرِ انام
اے منبرِ خودی کے حیات آفریں پیام
(۵۴)
اے نطقِ زندگی کے مقدس ترین نام
اے چرخِ انقلاب کے ابرِ جواں خرام
غازہ ہے تیرا خون رخِ کائنات کا
ہر قطرہ کوہِ نور ہے تاجِ حیات کا

جس بحرِ ظلم و جور کے گرداب میں تھا تو
نازل پہاڑ پر ہو تو بن جائے آب جو
(۵۵)
سینے میں ابر کے نہ رہے روحِ رنگ و بو
آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے لہو
یخ تک بہ رنگِ آتشِ دوزخ دہک پڑے
ماتھے سے آگ کے بھی پسینہ ٹپک پڑے

۵۶

اے حق نوازِ امیرِ نبوت بدوش امام — اے خنجرِ برہنہ وا اے تیغِ بے نیام
اے آسمانِ درسِ عمل کے مہِ تمام — اے تیرگی کی بزم میں خورشید کے پیام
رہتی ردائے شام کی ظلمت ہی دین پر
ہوتا نہ تو تو صبح نہ ہوتی زمین پر

۵۷

پھر بزمِ آب و گِل میں ہے کہرام اے حسین — پھر حق ہے آفتابِ لبِ بام اے حسین
پھر حُریت ہے موردِ الزام اے حسین — پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسین
ذوقِ فساد و ولولۂ شر لیے ہوئے
پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے

۵۸

گردونِ گیر و دار کا مہرِ مبیں ہے تو — ہاں خاتمِ حیاتِ ابد کا نگیں ہے تو
کونین کا تخیّلِ عہد آفریں ہے تو — اک زندہ حدِّ فاصلِ دنیا و دیں ہے تو
پھر دشتِ جنگ کو ہے ترا انتظار اٹھ
اٹھ روزگارِ تازہ کے پروردگار اٹھ

۵۹

اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار — مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار — پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
اے زندگی جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے

۶۰

پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو
سرمایہ پھر ہے برسرِ آزار دوستو
تا کے یہ خوفِ اندک و بسیار دوستو
تلوار، ہاں اُٹھی ہوئی تلوار دوستو
جو تیز تر ہو خونِ امارت کو چاٹ کر
رکھ دے جو سیم و زر کے پہاڑوں کو کاٹ کر

۶۱

بل کھا رہے ہیں دہر میں پھر سیم و زر کے ناگ
گونجے ہوئے ہیں گنبدِ گرداں میں غم کے راگ
پھر موت رخشِ زیست کی تھامے ہوئے ہے باگ
تا آسماں بلند ہو اے زندگی کی آگ
فتنے کو اپنی آنچ کے جھولے میں جھونک دے
ہاں پھونک دے قبائے امارت کو پھونک دے

۶۲

اے دوستو فرات کے پانی کا واسطہ
آلِ نبی کی تشنہ دہانی کا واسطہ
شبیر کے لہو کی روانی کا واسطہ
اکبر کی ناتمام جوانی کا واسطہ
بڑھتی ہوئی جوان امنگوں سے کام لو
ہاں تھام لو حسین کے دامن کو تھام لو

۶۳

آئینِ کشمکش سے ہے دنیا کی زیب و زین
ہر گام ایک بدر ہو ہر سانس اک حنین
بڑھتے رہو یوں ہی پئے تسخیرِ مشرقین
سینوں میں بجلیاں ہوں زبانوں پہ یا حسین
تم حیدری ہو سینۂ اژدر کو پھاڑ دو
اس خیبرِ جدید کا در بھی اکھاڑ دو

۶۴

جاری رہے کچھ اور یونہی کاوشِ ستیز
ہر وار بے پناہ ہو ہر ضرب لرزہ خیز
وہ فوجِ ظلم و جور ہوئی مائلِ گریز
اے خون اور گرم ہو، اے نبض اور تیز
عفریتِ ظلم کانپ رہا ہے اماں نہ پائے
دیوِ فساد کانپ رہا ہے اماں نہ پائے

تاخیر کا یہ وقت نہیں ہے دلاورو
آواز دے رہا ہے زمانہ بڑھو بڑھو
٦٥
ایسے میں باڑھ پر ہے جوانی بڑھے چلو
گرجو مثالِ رعد گرج کر برس پڑو
ہاں زخم خوردہ شیر کی ڈھکار دوستو
جھنکار، ذوالفقار کی جھنکار دوستو!

اے حاملانِ آتشِ سوزاں بڑھے چلو
اے پیروانِ شاہِ شہیداں بڑھے چلو
٦٦
اے خانمانِ صرصر وطوفاں بڑھے چلو
اے صاحبانِ ہمتِ یزداں بڑھے چلو
تلوار شمرِ عصر کے سینے میں بھونک دو
ہاں جھونک دو یزید کو دوزخ میں جھونک دو

دیکھو وہ ختم ظلم کی حد ہے بڑھے چلو
اپنا ہی خود یہ وقتِ مدد ہے بڑھے چلو
٦٧
بڑھنے میں عزتِ اب وجد ہے بڑھے چلو
وہ سامنے حیاتِ ابد ہے بڑھے چلو
الٹے رہو کچھ اور یونہی آستین کو
الٹی ہے آستیں تو پلٹ دو زمین کو

٦٨

اے جانشینِ حیدرِ کرار... المدد
اے منچلوں کے قافلہ سالار المدد
اے امرِ حق کی گرمئ بازار المدد
اے جنسِ زندگی کے خریدار المدد

دنیا تری نظیرِ شہادت لیے ہوئے
اب تک کھڑی ہے شمع ہدایت لیے ہوئے